ملکؔ محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم ترجمہ

مثنوی

بتخانۂ خلیل

ملک محمد جائسی کی شہرۂ آفاق پدماوت کا ترجمہ

مصنف

حافظ خلیل حسن خلیل مانکپوری

(برادر فصاحت جنگ جلیل مانکپوری)

مرتب:

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

- اشاعت ——— ۱۹۹۴ء
- اڈیشن ——— پہلا
- تعداد ——— پانچ سو
- کتابت ——— محمد عبدالرؤف
- سرورق ——— سلام خوشنویس
- مطبع ——— اعجاز پریس۔ چھتہ بازار حیدرآباد
- قیمت ——— ۶۰ روپے
- ناشر ——— علی احمد جلیلی

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

ملنے کے پتے

- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد
- علی احمد جلیلی ۱/۳۳/۷-۱-۲۲ جلیلی منزل سُلطان پورہ۔ حیدرآباد۔ ۲۴

اِنتساب

دکن کے مثنوی نگاروں

غلام علی دکنی ۔ سیّد محمد فیاض ویلوری ــــ
سیّد محمدؔ خاں عشرتی

کے نام

جنھوں نے ملک محمد جائسی کی ہندی پدماوت
کو دکنی میں منظوم کیا

پنجۂ نگاریں (بتخانۂ خلیل) اردو کی افسوسناک حد تک بھولی ہوئی مثنویوں میں سے ایک ہے۔ مصنف کے نام سے متاثر ہونے والوں نے اس شاعر کے خونِ جگر کی یہ قدر کی کہ آج اس کام کو بھی کوئی نہیں جانتا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اشاریہ

مثنوی "تبخانۂ خلیل" کا ایک مطبوعہ نسخہ عرصۂ دراز سے میرے کُتب خانے میں ہے۔ ۱۹۳۸ء میں یہ نسخہ اس وقت میرے ہاتھ آیا۔ جب مَیں حیدرآباد سے اپنے وطن مانکپور ہوتا ہوا اپنے ایک عزیز کے یہاں بلرام پور گیا تھا۔ مثنوی کے خالق حافظ خلیل حسن خلیلؔ مانکپوری (برادر کلاں جلیل مانکپوری) ہیں جو رشتہ میں میرے چچا ہوتے ہیں۔ ریاست بلرام پور میں ان کی حیثیت شاعر درباری تھی۔ ریاست کی طرف ہی سے یہ مثنوی شائع ہوئی۔

مثنوی "تبخانۂ خلیل" ملک محمّد جائسی کی پدماوت کا منظوم ترجمہ ہے۔ چنانچہ مثنوی کے ابتدائی اشعار میں یہ اظہار کر دیا گیا ہے کہ ملک محمّد جائسی اس داستان کو بیان کر چکا ہے اور عبرتؔ نے بھی اسے مثنوی کا روپ دیا ہے۔ عبرتؔ کے بارے میں اور کوئی تفصیل نہ تھی اس لئے اس شاعر اور اس کی مثنوی تک رسائی نہ ہو سکی اور اس کام کو آگے بڑھانے کا خیال ادھورا ہی رہا۔

حُسن اتفاق سے ریسرچ سنٹر حیدرآباد کے بانی محمّد عبدالصمد خاں صاحب سے ایک دن اس بات کا ذکر آیا تو انھوں نے نہ صرف عبرتؔ کی مثنوی شمع و پروانہ کے دو نسخے فراہم کر دیے بلکہ فارسی خط میں لکھا ہوا ملک محمّد جائسی کی پدماوت کا ایک نسخہ بھی اپنے ریسرچ سنٹر سے ڈھونڈ نکالا۔ ان کتابوں کی فراہمی نے پدماوت کا کام

کیا اور بتخانۂ خلیل کو متعارف کرنے کا موقع مل گیا۔

بعد ازاں اسی ریسرچ سنٹر کے ذخیرہ میں مجھے کئی رسالے نگار، ہماری زبان اور اردو کراچی ایسے ملے جن میں اردو مثنویوں سے متعلق کافی مواد تھا۔ اس سلسلے میں اردو مثنوی کے ارتقا پر لکھی ہوئی کئی کتابوں پر میں نے نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ مثنوی "بتخانۂ خلیل" کا علم مثنوی کی تاریخ لکھنے والوں کو نہیں ہے۔ صرف ڈاکٹر سید محمد عقیل کی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقاء" میں بتخانۂ خلیل کا مختصر تعارف ہے۔ البتہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کے دیگر منظوم ترجموں میں عبرت کی شمع و پروانہ اور ہاشم علی بریلوی کی مثنویوں کا ذکر اکثر کتب میں موجود ہے۔

پدماوت کے اردو منظوم ترجموں میں میری رسائی صرف دو ترجموں یعنی بتخانۂ خلیل اور شمع و پروانہ تک ہی رہی۔ ہاشم علی بریلوی کی مثنوی فراہم نہ ہوسکی۔

اِس مواد کے علاوہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کے تین نسخے اور ایک مخطوط بھی میرے پیش نظر رہا ہے۔

۱۔ پدماوت بھاشا ملک محمد جائسی (ہندی رسم خط میں)۔ اس کا سن اشاعت ۱۹۲۰ء ہے اور یہ نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ پدماوت (فارسی رسم خط میں)۔ شعلہ طور کانپور ۱۸۶۱ء۔

۳۔ پدماوت (فارسی رسم خط میں)۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔

پدماوت بھاشا کا ایک مخطوطہ جو ناقص الآخر ہے اس کے سن کتابت کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس کے بوسیدہ کاغذ اور روشنائی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ مخطوطہ سو سال قبل کا ہے۔ اس کا مقابلہ پدماوت کے مطبوعہ نسخوں سے کیا تو پتہ چلا کہ املا کی بہت غلطیاں ہیں۔ اشعار کی ترتیب میں بھی فرق ہے بعض بند چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

فارسی رسم خط اور ہندی رسم خط کے نسخوں کا جائزہ بتلاتا ہے کہ اکثر

الفاظ کے املا میں اختلاف ہے۔ مثلاً

چھاجہ اور چھاج۔ الوپا اور الوپاں۔ تہارا اور تمھرا۔ کا ہو اور کو ہو۔ جوت اور جیوت وغیرہ۔

مطالعہ سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سنسکرت اور ہندی کے بعض الفاظ میں املا کو بدل دیا گیا ہے یعنی پروت کو پربت ورن کو برن اور ورہ کو برہ لکھا گیا ہے کہیں کہیں الفاظ کی تبدیلی بھی ملتی ہے جیسے بھومی کی جگہ بہم اور گھر کی جگہ گہہ جو ہم معنی ہیں۔ فارسی رسم خط کے نسخوں میں ک اور گ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جس سے پڑھنے میں بڑا تسامح ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ اس حاصل شدہ مواد سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے حافظ خلیل حسن خلیل کی مثنوی بتخانۂ خلیل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس انحراف کا بھی نوٹ لیا ہے جو ملک محمد جائسی کی پدماوت اور خلیل کے ترجمے کے متن میں ہے تقابلی مطالعہ کے لئے عبرت و عشرت کی شمع و پروانہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور حسب ضرورت میر حسن اور گلزار نسیم کی مثنویوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

علی احمد جلیلی

ملک محمدؐ جائسی

تعارف

اصناف سخن میں مثنوی کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین مناظر قدرت، جذبات کی تصویر کشی، فلسفہ و تصوف کے مباحث، حسن و عشق کی واردات اور رزم و بزم کی داستانیں بخوبی نظم کی جا سکتی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو ہے وہ اور کسی صنف کو حاصل نہیں۔ بالخصوص واقعہ نگاری کے لئے اس سے بہتر کوئی اور اسلوب نہیں

اردو مثنوی دیگر اصناف سخن کی طرح فارسی کی مرہون منت رہی ہے۔ اردو کے آغاز یعنی پہلے ہی دور سے مثنوی لکھنے کی کوششیں ملتی ہیں۔ دکن سے اس کی شروعات ہوئی اور شمالی ہند میں ارتقائی منازل طے کئے۔ ابتدائی مثنویوں میں بیشتر ایسی ہیں جو فارسی سے ترجمہ کی گئیں۔ پھر جب طبعزاد مثنویوں کا رواج عام ہوا تو مثنویوں سے اردو کا دامن بھر گیا۔ ان میں ایسی مثنویوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کی گئیں۔ پلاٹ کے اعتبار سے یہ مثنویاں نثری داستانوں کی منظوم شکلیں ہیں۔ جائسی کی پدماوت کے اردو منظوم ترجمے اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت سے اردو دنیا صرف اس حد تک متعارف ہے کہ اردو مثنوی کے ارتقاء کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی اکثر تذکرہ نگاروں

کے یہاں ملتا ہے[1]۔ کچھ محققین نے چیدہ چیدہ مضامین میں اس کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ ملک محمدؒ جائسی پر ایک کتاب انجمن ترقی اردو دہلی کی طرف سے بھی شائع ہوئی ہے لیکن پدماوت کے اردو منظوم ترجموں پر کوئی مستقل کام ابتک نہیں ہوا ہے۔

ملک محمدؒ جائسی

ملک محمدؒ نام۔ محمدؒ تخلص۔ سولھویں صدی عیسوی میں ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ ۸۷۰ھ م ۱۴۶۳ء کے لگ بھگ ایک غریب کسان خاندان میں پیدا ہوئے[2]۔ مقام پیدائش کا پتہ نہیں۔ کسی مقام کے رہنے والے تھے۔ جائس[3] آکر یہیں بس گئے اور جائسی کہلانے لگے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

جائس نگر دھرم استانو یہاں آئی کوئی کتھا بکھانو

والد کا نام شیخ ممریز بتایا جاتا ہے۔ ماں کے نام کا پتہ نہیں۔ دونوں کا انتقال جائسی کی کمسنی

---

[1] سولھویں صدی عیسوی میں شیر شاہی عہد میں ملک محمدؒ جائسی ایک شاعر ہوا ہے۔ اس نے پدماوت داستان نظم کی۔ اس کی بحر ہندی رکھی ہے۔ (آبحیات ص ۱۸)

امیر خسرو کے بعد شیر شاہی عہد میں ملک محمدؒ جائسی پیدا ہوئے۔ وہ بھاکا زبان کے ایسے زبردست شاعر تھے کہ خود ہندی میں آج تک ایسا سخنور پیدا نہیں ہوا۔ ان کی مثنوی پدماوت آج موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے۔ (مقالات شبلی حصہ اول ص ۲۰)

[2] بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک تاریخ پیدائش ۹۰۰ھ ہے۔ اس لحاظ سے وفات ان کی ۵۰ سال کی عمر میں ہوئی۔ لیکن ایک روایت کے بموجب وہ ۷۹ برس زندہ رہے اس لئے اس تاریخ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ [3] اودھ کا ایک قدیم تاریخی قصبہ جو آج کل رائے بریلی میں ہے۔ اولاً اس کا نام اودیا نگر تھا۔ یہ مقام بھر (راجپوت قوم) کا مستقر تھا۔ ۱۰۲۴ء میں غیاث الدین کے نائب نجم الملک نے اسے فتح کیا۔ تب سے اسکا نام جائس پڑا۔ (ملک محمدؒ جائسی کلب مصطفےٰ سنہ ۱۹۴۱ء)

میں پیدا ہو گیا تھا۔ نانا کا نام شیخ اللہ داد تھا۔ بچپن انھیں کے یہاں مانکپور ضلع پرتاب گڑھ میں گزرا۔ سات سال کی عمر میں چیچک نکلی تو ان کی ماں نے شیخ مدار کے مزار پر ان کی زندگی کی منت مانگی تھی۔ زندگی تو بچ گئی لیکن ایک آنکھ ضائع ہو گئی[1]۔ چونکہ کمسن تھے اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا اس لئے فقیروں کے ساتھ رہنے لگے انہیں لوگوں کی صحبت سے متاثر ہو کر فقیرانہ روش اختیار کی اور ساری زندگی فقیری میں گزاری۔ مخدوم سید اشرف جہانگیر کچھوچھوی کے مرید ہوئے۔ رموز طریقت سے شناسائی اور معرفت کی آگہی کے سبب مرجع خاص و عام ہوئے۔

ذریعہ معاش زراعت تھا۔ چند بیگھے آبائی زمین تھی۔ جوت کر اوقات بسر کرتے تھے۔ اس قصبہ کے ایک محلے میں جو کنجانے کے نام سے مشہور ہے ملک محمد کا مکان اب تک محفوظ ہے۔ بعض روایتوں کی بناء پر ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ۷ بیٹے تھے۔ کھانا کھاتے وقت مکان کی چھت بیٹھ گئی۔ سب دب کر مر گئے۔ اس واقعہ نے ان کے دل میں اور بھی سوگواری بھر دی تھی۔ ان کا سسرال مانکپور بتایا جاتا ہے۔

حسن ظاہری سے محروم تھے۔ اپنے حلیے کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

محمدؐ کوئی جو پریم کے نا رکت رکھت نا ماس
من بچھ دیکھیا سو ہنسا سنی تہہ آئی آنس

(ملک محمد حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کے بدن پر نہ گوشت ہے اور نہ جسم میں خون

---

[1] یک چشم ہونے کو بنا دلیل کمال ٹھہرایا ہے۔ کہتے ہیں: "ایک آنکھ کا شاعر محمد ہنر مند ہے چاند کے جیسا دنیا میں خدا نے اُتارا جسکو سیاہی دی اور روشنی بخشی اسطرح مجھکو بھی نظر آتا ہے ایک آنکھ سے۔ وہ ایک آنکھ ایسی ہے جیسے زہرہ سب تاروں میں۔ جب تک آم داغی نہیں ہوتا خوشبو نہیں دیتا خدا نے سمندر کا پانی کھاری کیا تب وہ اسطرح ناپید اکنار ہوا۔"

جو صورت دیکھتا ہے وہ ہنستا ہے مگر جو بات سنتا ہے وہ روتا ہے ۔)

ایک روایت کے بموجب جائسی ایک بار شیر شاہ سوری کے دربار میں بھی گئے تھے شیر شاہ ان کے بھدے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑا۔ درباریوں نے بھی اس کا ساتھ دیا جائسی نے برجستہ کہا کہ مجھ پر ہنستا ہے یا بنانے والے پر۔ اس پر شیر شاہ بہت شرمندہ ہوا اور معافی چاہی۔ بعض اس روایت کو جھٹلاتے ہیں کہتے ہیں کہ وہ کبھی دربار گئے ہی نہیں بشیر شاہ خود ان کی شہرت سن کر ان کے پاس آیا تھا۔ میر حسن دہلوی نے اس واقعہ کو اکبر بادشاہ کے حوالے سے منظوم کیا ہے۔ جن کو جائسی نے یوں جواب دیا تھا۔

ہنس پڑے ماٹی پہ تم اے شہریار — یا کہ میرے پر ہنسے اے تاجدار
کچھ گنہ میرا نہیں اے بادشاہ — شرخ واسن تو ہوا اور میں سیاہ
اصل میں ماٹی تو ہے سب ایک ذات — اختیار اس کا ہے جو ہے اسکے ہات

یہ درست نہیں کیوں کہ جائسی اکبر کے جنم کے وقت ہی سنہ ۱۵۴۲ء میں انتقال کر چکے تھے ۔

ملک محمد نے جہاں فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں عبادت و ریاضت کے مراحل طے کئے وہیں انھیں پنڈتوں کی بھی صحبت ملی تھی۔ اس لئے وہ ہندؤں کے شاستروں سے اچھی طرح واقف تھے! ابھی نوعمر تھے کہ شاعری کی دھوم ہوگئی بیس سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے. ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کے دوہے گائے جاتے تھے اور بارہ ماسہ عوام کی زبانوں پر تھا۔ کہتے ہیں کہ امیٹھی کا راجا جائسی کی شاعری سے متاثر ہو کر ان کا بھگت ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے پاس امیٹھی بلا لیا اور تادم آخر اپنے یہاں مہمان رکھا۔ یہیں امیٹھی میں ۷۹ سال کی عمر میں سنہ ۹۴۹ھ م سنہ ۱۵۴۲ء میں انتقال کیا۔ یہیں مدفون ہیں ۔

پدماوت

ہندی نظم میں مثنویوں کو ہر دور میں مقبولیت رہی ہے۔ گو وہاں اس کا کوئی مخصوص نام نہیں۔ ویرکال کی تقریباً تمام نظمیں مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ اُردو مثنویوں میں جس طرح ہر مصرع مطلع کی صورت میں قافیہ کی پابندی کے ساتھ آتا ہے ہندی میں بھی زیادہ تر چھوٹی بحریں استعمال کی جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ۷ یا ۸ اشعار کے بعد ایک طویل دوہا ٹیپ کی صورت میں آتا ہے۔ مثنوی کی شکل برقرار رہتی ہے[۱] پدماوت اسی طرز پر لکھی گئی ہے۔

ملک محمّد جائسی کی یوں تو اور بھی کئی تخلیقات۔ اکھراوٹ، راگنی سوراٹ اور آخری کلام وغیرہ ہیں لیکن جس شاہکار نے ان کو زندۂ جاوید کیا وہ ان کی تصنیف پدماوت ہے۔ ہندی والوں نے باعتبار زبان، معانی، ترتیب و تسلسل سیر نگاری اور اسلوب نگارش پدماوت کو ہندی ادب کا جگمگاتا ہیرا کہا ہے۔ رومانی مثنویوں کے زمرہ میں اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ہندی کی مشہور پریم کہانیوں اندراوتی، مرگاوتی اور چترا وتی کے مقابلہ میں پدماوت کو برتری حاصل ہے۔ پدماوت کی زبان بھاشا (بھاکا) یعنی پوربی اودھی[۲] ہے۔ اس میں مغربی ہندی، فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی بھی شمولیت ہے۔

۱: ڈاکٹر گیان چند جین۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں ۱۹۶۵ء ص ۶۳

۲: اودھی صوبہ اودھ، ضلع آگرہ، چھوٹا ناگپور، بگھیل کھنڈ اور صوبہ متوسط میں بولی جاتی ہے۔ اودھی، پوربی اور پچھمی نام سے دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پدماوت کی زبان کو پوربی اودھی کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔
(ملک محمّد جائسی۔ سیّد کلب مصطفےٰ ۱۹۴۱ء ص ۹۴)

سر جارج گریرسن کے مطابق پدماوت سے اس زمانے کی زبان اور تلفظ کا پتہ چلتا ہے ہندو مصنف قدامت پرستی کی وجہ سے اپنے الفاظ کے ہجا پرانے سنسکرت کے مطابق کرتے تھے لیکن جائسی نے اس کا اتباع نہیں کیا۔

پدماوت کو جائسی نے فارسی رسم خط میں لکھا۔ اس کا مخطوط فارسی رسم خط میں ہی ہے۔ ہندی کے متعدد ادیبوں کا اتفاق ہے کہ جائسی کی پدماوت اور اس کی دوسری تصانیف کا رسم خط فارسی ہی تھا۔ گریرسن، او جھا جی، ستیالام اور بابو شیام سندر وغیرہ نے پدماوت کے رسم خط کو فارسی ہی قرار دیا ہے۔ لیکن اب پدماوت کے مطبوعہ نسخے ناگری رسم خط میں ہی ملتے ہیں۔ یہ مثنوی پچیس برس کے طویل عرصہ میں لکھی گئی۔ سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں اس کے لکھنے کا آغاز ہوا اور شیر شاہ سوری کے دور میں تمام ہوئی۔ سر جارج گریرسن نے سنہ تصنیف ۹۴۷ھ م ۱۵۴۰ء لکھا ہے۔ پدماوت کے اس صدی کے نسخوں میں بھی تصنیف کا یہی سنہ یعنی ۹۴۷ھ ہے۔ تاہم اس کی صحت میں اختلاف ہے بعض محققین ۹۲۷ھ بتاتے ہیں۔ اندازے کے مطابق پدماوت کی تکمیل کا سلسلہ ان کے آخری وقت تک جاری رہا۔ جائسی اپنی پدماوت کے اختتامی حصہ میں لکھتے ہیں :۔

"اے محمدؐ تیری عمر گزر گئی اور جوانی مفت خراب گئی۔ قوت بدن کی جاتی رہی اور جسم کمزور ہو گیا۔ آنکھیں روتے روتے جاتی رہیں۔ دانتوں کے گر جانے سے رخسار بے رونق ہو گئے۔ عقل کے زائل ہونے سے لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ بالوں کی سیاہی جاتی رہی، سر ہلنے لگا۔ جوانی جو جیت لے گئی۔ جب تک زندگی ہے جوبن ساتھ ہے۔ جب موت آئی معاملہ دوسرے کے ہاتھ ہے۔"

چنانچہ ڈاکٹر گیان چند بھی پدماوت کا سال تصنیف ۹۴۷ھ ہی قرار دیتے ہیں[۱]۔ جبکہ جائسی کا سنہ وفات ۹۴۹ھ ہے۔ امیر احمد علوی نے اس سے اختلاف کیا ہے[۲]۔ ان کے نقطۂ نظر سے جائسی پدماوت کے اختتام کے بعد بھی مدت تک زندہ رہے کیونکہ ان کی تصنیف راگنی سورٹھ (جو ایشائک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں ہے) عہد اکبر کی تالیف سمجھی جاتی ہے۔

اس وقت میرے سامنے جائسی کی پدماوت کا جو نسخہ ہے[۳] وہ ہندی رسم الخط میں ہے۔ اس کے ٹائٹل کی عبارت یہ ہے۔

پدماوت بھاشا

راجہ رتن سین اور پدماوت رانی کی پرسدھ کہانی

لیکھک :۔ ملک محمد جائسی

نولکشور پریس میں مدرت اور پرکاشت بسنہ ۱۹۲۰ء آٹھویں بار

یہ نسخہ ۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد (۶۳۳۰) ہے۔ اردو مثنویوں کی طرح جائسی نے اس کا آغاز حمد و نعت اور منقبت سے کیا ہے۔ پھر بادشاہ وقت شیر شاہ سوری کی مدح ہے۔ کچھ اشعار مرشد سید اشرف جہانگیر کی منقبت میں بھی ہیں۔ ان روایات کی تکمیل کے بعد مقام جائس اور سنگلدیپ[۴] کا تعارف کراتے ہوئے اصل داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ پدماوت کی پیدائش سے داستان کے خاتمہ

---

[۱] ڈاکٹر گیان چند جین ۔ پدماوت اردو نظم ۔ اردو کراچی سنہ ۱۹۵۱ء

[۲] امیر احمد علوی ۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت ۔ نگار جولائی سنہ ۱۹۳۶ء ص ۲۲

[۳] پدماوت کا یہ ہندی اڈیشن خلیل حسن خلیل مانکپوری کے تصرف میں رہا ہے جنھوں نے اس کا ترجمہ کیا۔ [۴] سنہل دیپ اور سراندیپ نام بھی اس کو دیا جاتا ہے۔

تک مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ جو کہانی منظوم کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

خلاصۂ داستان

سنگل دیپ کے راجا گندھرب سین کی بیٹی پدماوت بڑی مرادوں کے بعد پیدا ہوئی اس نے ایک توتا (ہیرامن) پال رکھا تھا جو انسانوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ پدماوت اس جہاں دیدہ مصاحب خاص سے اپنا جی بہلاتی تھی۔ وہ اس عمر کو پہنچ چکی تھی کہ کسی کو اپنا شریک زندگی بنانا چاہتی ہے۔ راجا نے اب تک کسی کو اس کے لئے منتخب نہیں کیا تھا۔ پدماوتی کو ملول دیکھ کر توتے نے اس کے لائق شوہر تلاش کرنے کی اجازت چاہی۔ اس کی اطلاع گندھرب سین کو ہو گئی۔ پدماوت کے پاس توتے کا رہنا پسند نہ آیا۔ اسے مار ڈالنے کا حکم دیا لیکن توتا کسی طرح نکل بھاگا اور ایک چڑیمار کے دام میں جا پھنسا۔ اس نے ایک برہمن کو فروخت کر دیا۔ برہمن اس توتے کو اپنے ساتھ چتوڑ لایا اور راجہ رتن سین کے ہاتھ بیچ دیا۔ توتا راج محل میں رہنے لگا۔

ایک دن جب رتن سین شکار کو گیا ہوا تھا اس کی رانی ناگمت نے بن سنور کر اپنے حسن کی داد توتے سے چاہی۔ توتے کو اس کا غرورِ حسن پسند نہ آیا۔ ناگمت کے مقابلے میں پدماوت کے حسن کا ذکر کر بیٹھا۔ رانی یہ سنکر گھبرا گئی اور اس خوف سے کہ کسی دن وہ راجہ سے پدماوت کے حسن کی تعریف نہ کر بیٹھے اسے مار ڈالنے کے لیے خادمہ کے سپرد کیا۔ خادمہ نے مصلحتاً اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا اور پھر رتن سین کے ناراض ہونے پر اس کے حوالے کر دیا۔ توتے نے جو کچھ گزرا تھا وہ سب کہہ سنایا توتے سے پدماوت کے حسن و جمال کی تعریف سن کر رتن سین اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا راج پاٹ چھوڑ جوگی بنا اور توتے کو لیکر پدماوت کی تلاش میں سراندیپ کی طرف چل پڑا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہلے ملک کالنگ پہنچا۔ وہاں کے راجہ جگپتی سے

جہاز لیکر راستے کے مصائب جھیلتا اور سات سمندر پار کرکے سراندیپ پہنچا۔

رتن سین کو مہادیو کے مندر میں چھوڑ کر توتا پدماوت کے پاس گیا اور سارا احوال کہہ سنایا۔ رتن سین کا اس کے لئے جوگی بن جانے کی بات کا اثر پدماوت کے دل پر بہت ہوا۔ وہ بسنت پنچمی کی پوجا کے بہانے اپنی سکھیوں کو لیکر مہادیو کے مندر پہنچی۔ جوگی راجہ اسے دیکھ کر ہوش کھو بیٹھا۔ پدماوت جوگی کے سینے پر یہ لکھ کر چلی گئی کہ — جوگی تو نے بھیک حاصل کرنے کے لائق جوگ نہیں لیا۔ جب پھل ملنے کا وقت آیا تو سو گیا۔ رتن کو جب ہوش آیا تو رانی جا چکی تھی۔ مایوس ہو کر آگ میں جل جانے کا ارادہ کیا۔ دیوتاؤں کو اس کی خبر ہوگئی۔ انھوں نے مدد کرنے کی ٹھانی۔ پاربتی نے پری کا روپ دھار کر راجہ کی محبت کا امتحان لیا۔ کامیاب ہو جانے پر مہادیو نے قلعہ میں داخل ہونے کا راستہ بتایا۔ رتن سین نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جب داخل ہونے کی کوشش کی گرفتار ہوگیا۔ راجہ گندھرپ سین نے اسے سولی دینے کا حکم دیا۔ اس وقت مہادیو دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ راجہ کے پاس آئے اور اسے سمجھایا۔ توتے بھی بروقت آکر یہ راز فاش کیا کہ رتن سین جوگی نہیں چتوڑ کا راجا ہے۔ حقیقت معلوم ہونے پر رتن سین کا بیاہ پدماوت سے ہوگیا۔

ادھر چتوڑ گڑھ میں رانی ناگمت اپنے شوہر رتن سین کی جدائی میں تڑپ رہی تھی ناگمت کی بیقراری دیکھ کر ایک پرندے نے اس کا پیغام اور خط رتن سین کو پہنچایا۔ خط پاتے ہی رتن سین، پدمنی کو لیکر سنگھل دیپ سے رخصت ہوا۔ جہاز ابھی آدھا سمندر میں تھا کہ رتن سین نے سمندر کے دیوتا کو ناراض کر دیا۔ سمندر میں طوفان آیا۔ کشتی ٹوٹ گئی۔ دونوں الگ الگ سمتوں میں بہہ نکلے۔ پدماوت کی مدد سمندر دیوتا کی بیٹی لکشمی نے کی اور رتن سین کی مدد سمندر کے دیوتا نے۔ اس طرح رتن سین پدمنی کو لیکر چتوڑ گڑھ آگیا۔

راگھو چیتن، رتن سین کے دربار کا سب سے بڑا پنڈت تھا۔ فریب کی علت میں راجا نے اسے جلا وطنی کا حکم دیا۔ پدماوت کا برہمن کو ناراض کرنا پسند نہ آیا اس نے

اسے محل کے نیچے بلوا کر اپنا کنگن جھروکے میں سے پھینکدیا۔ راگھو، رتن سین سے بدلہ لینے کے لئے دلی پہنچا۔ علاؤ الدین کا مہمان ہوا اور پدمنی کے حُسن کی تعریف کی۔

علاؤ الدین نے پدمنی کو طلب کیا جس پر رتن سین جنگ کے لئے آمادہ ہوگیا۔ پہلی جنگ کے بعد علاؤ الدین نے صلح کرلی۔ رتن سین نے قلعہ میں سلطان کی دعوت کا بڑا اہتمام کیا۔ وہیں راگھو برہمن کی مدد سے علاؤ الدین نے پدمنی کا عکس آئینے میں دیکھا۔ بعد میں رتن سین کو دھوکے سے قید کرلیا۔

رتن کے مخالف کھمبل میر کے راجہ دیو پال کو جب رتن سین کے قید ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے راجا کی غیر موجودگی میں پدماوت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بعد ازاں پدمنی نے گورا اور بادل کی مدد سے رتن سین کو آزاد کرالیا۔ دیو پال سے بدلہ لینے کے لئے رتن سین نے کھمبل میر پر حملہ کردیا۔ دیو پال مارا گیا۔ رتن سین زخمی ہوگیا اور جانبر نہ ہوسکا۔ رتن سین کے مرنے پر اس کی دونوں رانیاں ناگمت اور پدماوت ستی ہوگئیں۔

داستان کی حقیقت

داستان کے دو حصے ہیں جیسا کہ خلاصۂ داستان سے ظاہر ہے۔ پہلا حصہ تخیلی داستان ہے۔ اس میں بولنے والے توتے کی رہنمائی میں راجہ رتن سین سنہل دیپ جاکر پدمنی کو بیاہ لاتا ہے۔ اس حصہ میں دیومالائی عناصر یعنی دیوی دیوتاؤں کی مدد خیالی سمندروں، راکشسوں کی مردم آزاری اور اسی قسم کے متعدد تذکرے ہندوؤں کے دھارمک افسانوں سے شامل کئے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ نیم تاریخی ہے جس میں راگھو نامی برہمن سے سلطان علاؤ الدین پدمنی کا ذکرِ حُسن کر اس کو حاصل کرنے کے لئے چتوڑگڑھ پر فوج کشی کرتا ہے۔

مورخانہ نقطۂ نظر سے داستان میں سچائی اور صداقت کا عنصر بہت تھوڑا

ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ضیاء الدین برنی اور دیگر مورخین رانی پدماوت کا کوئی ذکر
نہیں کرتے۔ البتہ فرشتے نے مختصر الفاظ میں پدماوت کا ستی ہونا بیان کیا ہے۔
پروفیسر حبیب (یونیورسٹی علیگڑھ) نے امیر خسرو کی تاریخ علائی کے انگریزی
ترجمے میں فتح چتوڑگڑھ کے حالات کے تحت فرشتہ کا لکھا ہوا قصہ پدمنی
فارسی سے نقل کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ امیر خسرو کے بیان کے مقابلہ میں
فرشتہ کا بیان مشکل سے ٹھیر سکتا ہے[1] البتہ آئین اکبری میں اس کہانی کے زیادہ اجزا
ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ چتوڑ کا راجہ رتن سین بڑا طاقتور راجہ تھا۔ اس کی
بیوی پدمنی بہت خوبصورت عورت تھی۔ علاؤالدین نے پدماوت کو حاصل کرنے
کے لئے چتوڑ پر حملہ کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو بادشاہ
نے راجہ کو صلح کا پیام بھیجا۔ رتن سین اس پر راضی ہو گیا لیکن علاؤالدین نے اسے
دھوکہ دے کر مار ڈالا اور چتوڑ پر قبضہ کر لیا۔ پدمنی نے جوہر کر لیا اور اس کے ہاتھ نہ
آئی۔ یہ اور بہت سی باتیں آئین اکبری میں ایسی ہیں جن پر سچ ہونے کا گمان نہیں کیا
جا سکتا۔

کرنل ٹاڈ نے بھی "راجستھان" میں اس کا ذکر کیا ہے اور قدرے
تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بھیم سی چتوڑ پر راج کرتا تھا۔ علاؤالدین
نے پدمنی کے لئے حملہ کیا اور راجہ کو قید کر کے چتوڑ کے پاس ہی نظر بند کر دیا۔
پدمنی نے اپنے چچا گورا اور اس کے بھتیجے بادل کی مدد سے راجہ کو رہا کرایا۔ گورا
مارا گیا۔ بادل اور راجہ آکر قلعہ بند ہو گئے۔ بادشاہ واپس دلی چلا گیا۔ ۱۳۰۳ء
میں علاؤالدین نے پھر چڑھائی کی۔ راجہ مارا گیا۔ پدمنی نے جوہر کیا۔

لیکن جائسی کی پدماوت پر بعض لکھنے والوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا

---

[1] سید کلب مصطفیٰ۔ ملک محمد جائسی۔ ۱۹۴۱ء

ہے کہ پدمنی کی ہستی بالکل فرضی ہے۔ اس نام کی کوئی عورت نہ تھی۔ علاؤ الدین کے
عہد میں کوئی راجہ رتن سین نامی نہ تھا۔ البتہ وہاں کے راجہ اور علاؤ الدین میں سیاسی
وجوہات کی بنا پر جنگ ہوئی تھی۔ سچ پوچھئے تو معتبر تاریخ فقط اتنی ہے کہ علاؤ الدین
نے ۱۲۹۷ھ میں چتوڑ فتح کرنے کے لئے فوج بھیجی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۳۰۳ھ
میں دوبارہ فوج کشی کی اور چتوڑ گڑھ کو گھیر لیا۔ چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوا۔
رامچندر شکلا اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ جائسی سے بہت پہلے اودھ کی
لوک کتھاؤں میں پدماوت کی کتھا بہت پرانی ہے۔ یہ قصہ پدمنی اور ہیرامن توتے کے
نام سے مشہور تھا۔ یہاں وہاں دیہاتوں میں رانی اور توتے کی کہانی آج بھی دہرائی
جاتی ہے جس طرح جائسی نے بیان کی ہے[1]۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔ اس کتھا
میں پہلی رانی جسے ناگمت کا نام دیا گیا ہے اپنا منھ آئینہ میں دیکھ کر کہتی ہے۔

دیس دیس تو پھرے سوٹیا مورے روپ اور کہوں دو ہے
(اے توتے تو ملک ملک گھوما ہے۔ میری صورت کا کوئی دوسرا بھی ہے)

توتا جواب دیتا ہے۔

کا بکھا نو سنہل رانی!
تیرے روپ بھرے سب پانی!
(سنہل رانی کا کیا ذکر کروں۔ تمہاری جیسی تو وہاں پانی بھرتی ہیں)

پدماوتی کتھا کے کچھ تانے بانے دو ایک پرانوں میں بھی ملتے ہیں جن میں پدمنی
ایک راجا کی پتنی ہے۔ شیو نے اسے وردان دیا کہ نارائن ہی تیرے پتی ہوں گے اور
اگر کوئی دوسرا مرد تجھے پتنی بھاؤ سے دیکھے گا تو اسی وقت ناری ہو جائے گا۔
ان کے علاوہ راجستھان کی کہانیوں میں رتن سی راجہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہی نام رشتے

---

[1] رامچندر شکلا۔ جائسی گرنتھاولی

اور آئینِ اکبری میں بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں تاریخ مسخ ہو کر لوک کتھا بن گئی۔

ان متضاد اور ملتے جلتے بیانات پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ پدماوت کے پلاٹ کا پورا ڈھانچہ اس زمانے کی مروج کتھاؤں اور نیم تاریخی واقعات پر قائم کیا گیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس مثنوی کی تکمیل میں شاعر کا تخیل زیادہ کارفرما ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی پدماوت جائسی کے شاعرانہ تخیل کی رہینِ منت ہے جائسی نے روایتوں سے بھی کئی مقامات پر اختلاف کیا ہے۔ دوسرے بیانوں میں راجہ اور سلطان میں صلح کے لئے عکس آئینے میں دیکھنے کی شرط رکھی گئی لیکن ملک محمدؐ نے شرط کے طور پر نہیں حسنِ اتفاق سے یہ سب کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ افسانہ واقعہ معلوم ہونے لگتا۔

پدماوت کے فارسی دکنی اور اردو

منظوم ترجمے

فارسی

عاقل خاں رازی	شمع و پروانہ	سنہ ۱۰۶۵ھ
عبدالشکور بزمی	پدماوت	سنہ ۱۰۲۸ھ

دکنی

فیاض ولی ویلوری	رتن پدم	۰
غلام علی	پدماوت	سنہ ۱۰۹۱ھ
سید محمد خاں عشرتی	دیپک پتنگ	سنہ ۱۱۰۰ھ

اُردو

عبرت و عشرت	شمع و پروانہ	سنہ ۱۲۱۱ھ
قاسم علی بریلوی	پدماوت	سنہ ۱۲۸۶ھ
خلیل حسن خلیل	بتخانۂ خلیل	سنہ ۱۳۳۲ھ

خلیل حسن خلیل کی پدماوت کے اردو منظوم ترجمہ پر قلم اٹھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیگر منظوم ترجموں کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

جائسی کی اودھی میں لکھی ہوئی پدماوت کو اتنی شہرت ملی کہ دوسری زبان والے بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں سب سے پہلے فارسی تراجم کا ذکر ضروری ہے کیوں کہ دکنی اور اردو والوں نے ان فارسی منظوم ترجموں سے خاصا استفادہ کیا ہے۔

۱۔ عاقل خاں رازی نے ۱۰۶۵ھ میں شمع و پروانہ کے نام سے اس کا منظوم ترجمہ کیا۔

۲۔ عبدالشکور بزمی نے بھی ۱۰۲۸ھ میں اپنی مثنوی میں پدماوت کو منظوم کیا۔

دکنی زبان میں حسب ذیل ترجمے مثنوی کی صورت میں ملتے ہیں۔

۱۔ غلام علی دکنی نے بعہد ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۹۱ھ م ۱۶۸۱ء میں پدماوت کو منظوم کیا۔ اس کا ایک ناقص الآخر قلمی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ یہ منظوم ترجمہ عبدالشکور بزمی کی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے[1]۔

۲۔ سید محمد فیاض ویلوری نے جائسی کی پدماوت کو رتن پدم کے نام سے منظوم کیا۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۱۱۷ تا ۱۴۰

یہ عالمگیر عہد کے شاعر ہیں۔ حیدر آباد دکن ان کا وطن تھا۔ مثنوی کا سنہ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔[1]

۳۔ سید محمد خاں عشرتی نے "دیپک پتنگ" کے نام سے پدماوت کا منظوم ترجمہ کیا سنہ تصنیف ۱۱۰۷ھ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ لائبریری حیدر آباد میں موجود ہے۔[2]

شمالی ہند میں اردو کے جو منظوم ترجمے ملتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ "شمع و پروانہ"۔ عزت و عشرت۔ سنہ ۱۲۱۱ھ م سنہ ۱۷۹۶ء

۲۔ پدماوت ۔ قاسم علی بریلوی۔ سنہ ۱۲۸۶ھ م سنہ ۱۸۷۱ء

۳۔ بتخانۂ خلیل ۔ حافظ خلیل حسن خلیل مانکپوری سنہ ۱۹۱۴ء

جہاں تک دوسرے ترجمے قاسم علی بریلوی کی منظوم پدماوت کا سوال ہے اس کے حوالے پدماوت کے اردو منظوم ترجموں کے ذکر میں یہاں وہاں ملتے ہیں "اردو" کراچی سنہ ۱۹۵۱ء کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۸۷۱ھ میں مطبع نولکشور لکھنؤ نے شائع کی۔ ایک تحریر کے مطابق قاسم علی بریلوی نے جائسی کی پدماوت سے براہِ راست بیت بہ بیت اور دوہرہ بہ دوہرہ اردو زبان میں منتقل کیا۔ لیکن شاعرانہ محاسن کی خوبیاں نہ ہونے کے سبب کم رتبہ ہے اس لئے گمنامی میں رہی۔[3] گیان چند جین، بریلوی کی اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نسخہ بہت ضخیم ہے۔ سب بیانات کی تفصیل اسی طرح ہے جیسی کہ اصل پدماوت میں ہے لیکن اس نسخہ کی زبان اتنی ناقص ہے کہ اس کے مفصل بیانات بھی بے لطف ہو کر رہ گئے ہیں۔ متروک اور غیر مانوس

---

[1] اس کا تذکرہ اشپرنگر اور اسٹورٹ نے کیا ہے لیکن اب نایاب ہے (علمی نقوش۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)

[2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو ص ۲۳۳

[3] فرمان فتح پوری۔ اردو کی منظوم داستانیں ص ۲۱۴

الفاظ، الفاظ کی غلط ہیئت ان سب کی وجہ سے مطالب میں اُلجھن پیدا ہوگئی ہے
چونکہ انھوں نے ہندی کا لفظی ترجمہ کرنا چاہا ہے اس سے خیالات میں غرابت آگئی ہے
مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں قاسم علی بریلوی کا منظوم ترجمہ قابل اعتنا نہیں
ٹھہرا اس لئے خلیل جو خلیل کی پدماوت تبخانہ خلیل کا جائزہ لیتے وقت تقابلی
مطالعہ کے لئے میں نے عبرت و عشرت کے منظوم ترجمہ ہی کو پیش نظر رکھا ہے
جو شمع و پروانہ کے نام سے موسوم ہے۔

شمع و پروانہ

پدماوت کا پہلا منظوم ترجمہ "شمع و پروانہ" کے نام سے ہے جو دو شاعروں
عبرت اور عشرت کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ عبرت نے اسے لکھنا شروع کیا لیکن
عمر نے وفا نہ کی تمام نہ کر پائے۔ بعد ازاں اس کی تکمیل عشرت نے کی۔

عبرت

ضیاء الدین نام۔ عبرت تخلص۔ آبائی وطن شاہجہاں آباد۔ پرورش رام پور
میں پائی۔ حکیم تھے۔ رامپور میں مطب کرتے تھے۔ اوائل عمر میں روہیل کھنڈ
آگئے تھے۔ یہاں رام پور کی بزم سخن کے ایک شاعر محمد خاں امیر سے تعلق پیدا
ہوا۔ یہیں انھیں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ نواب کے انتقال کے بعد مصطفےٰ خاں
عرف بنجو خاں کی ملازمت میں آئے۔ فن شعر میں نواب محبت خاں محبت کی شاگردی
سے بہرہ ور تھے۔

مضامین کس طرح کرتا میں ایجاد ۔ نہ ہوتا گر محبت خاں سا اُستاد

لہ گیان چند جین۔ پدماوت اردو۔ اگست ۱۹۵۱ء

عبرت ۱۱۸۸ھ میں رامپور آئے اور ایک اندازے کے مطابق ۱۲۰۴ھ تک زندہ رہے۔ مثنوی ان کی وفات سے پہلے نامکمل تھی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۴ھ سے پہلے ہی انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا جسے وہ ناتمام چھوڑ گئے۔[1] بعد ازاں اس کی تکمیل عشرت کے ہاتھوں ہوئی۔

عشرت

سید غلام علی نام۔ عشرت تخلص۔ بریلی کے ساکن تھے۔ ۱۲۱۱ھ میں رامپور آ کر یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ نواب رامپور نواب نصر اللہ خاں بہادر سلطان کے عہد میں یہاں ملازم تھے۔ مرزا علی لطف کے شاگرد تھے جو مرزا رفیع سودا سے تلمذ رکھتے تھے۔ عشرت کے ایک دوست مرزا قدرت اللہ شوق کے مکان پر ہر جمعہ کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں عشرت شریک ہوتے تھے۔ ایک روز شوق نے عشرت سے کہا کہ ان کے ایک مرحوم دوست نجو خاں کے کہنے پر عبرت نے ملک محمد جائسی کی پدماوت (بزبان بھاکا) کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جب کہانی راجہ رتن سین کے جوگی بن کر سنگلدیپ جانے تک پہنچی تو عبرت کا انتقال ہو گیا اور ترجمہ نامکمل رہ گیا آپ اسے تمام کر دیں۔ چنانچہ عشرت نے ڈیڑھ مہینے میں ترجمہ کر کے تاریخ اتمام نکالی۔

---

[1] غلام علی عشرت جنھوں نے عبرت کے بعد اس کی تکمیل کی پدماوت کے دیباچہ (۱۲۱۱ھ) میں عبرت کی موت کو ۷، ۸ سال قبل کا واقعہ ظاہر کرتے ہیں اس لحاظ سے عبرت کی تاریخ وفات ۱۲۰۴ھ یا ۱۲۰۵ھ قرار دی جا سکتی ہے۔

کہا دل نے اسے دیکھے جو شاعر ؛ بلا شک جانے تصنیف دو شاعر[1]

۱۲۱۱ھ

شوقؔ کی فرمائش کا ذکر عشرتؔ اپنے ترجمہ کے آغاز میں یوں کرتے ہیں:

کہ عشرتؔ پی کے تو الفت کا اک جام ؛ مری خاطر سے کر دے اس کو اتمام
کہ اس میں روح بھی عبرتؔ کی ہو شاد ؛ دُعائے خیر سے تجھکو کرے یاد
غرض قصہ ادھورا رہ نہ جائے ؛ جو ہیں مشتاق ان کے کام آئے
سو میں نے شوقؔ کی خاطر یہاں سے ؛ کہ ہیں مشفق مرے اعلیٰ جہاں سے
اٹھا کر اپنی کلک در نشاں کو ؛ کیا تحریر یوں اس داستاں کو

عبرتؔ نے شمع و پروانہ کے آغاز میں بطور تمہید کچھ اشعار قلمبند کئے ہیں۔ ان میں انہوں نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا راست ذِکر کرنے کے بجائے صرف داستان کے دو اہم کرداروں رتن اور پدم کا ذِکر کیا ہے اور کتاب کا نام شمع و پروانہ رکھنے کا اِعلان کیا ہے۔

مجھے اس پر جو تا شیرِ سخن ہے ؛ جنوں سرمایۂ عشق رتن ہے
رتن کے عشق کا شعلہ تھا سرکش ؛ پدم کے بھی لگا دی دلکو آتش
وہ دونوں عاشق و معشوق ہو جمع ؛ جلے اکبار جوں پروانہ شمع
اور ان کا لکھ کے میں نے قصہ تمام ؛ مدلل شمع و پروانہ رکھا نام

بعد کے اشعار میں قصہ کے ماخذ کے تعلق سے عاقل خاں رازیؔ کی فارسی مثنوی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

---

[1] اسی طرح تسلیم نے اپنی مثنوی خنجر عشق کا قطعۂ تاریخ موزوں کیا ہے اور تاریخ یوں نکالی۔ مناسب سمجھ کر دم اختتام ؛ کہا دل نے رکھ۔ خنجر عشق نام

۱۳۲۳ھ

مگر مضمون عاقل خان رازی | کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی
سو اس کی نظم کو تو دیکھ لا تو | بندھا ہو دے گا مضمون ایک یا دو
رقم ہے یہ جو مضمون شعلہ بنیاد | مری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
نہیں ہے گا یہ عبرت کا تقاضا | کہ مضمون لا کے باندھوں میں پرانا
میں غیروں کو ادب کرتا ہوں ارشاد | میں اپنے عصر کا ہوں آپ استاد

عبرت کے ان تمہیدی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر عاقل خاں رازی کی مثنوی رہی ہے چنانچہ مثنوی کا نام بھی وہیں سے لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ دعوی بھی ہے کہ ان کا اردو ترجمہ رازی کے فارسی ترجمے سے مستفیض نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ تعلی بھی ملتی ہے کہ وہ جدت پسند ہیں اور پرانا مضمون باندھنے کے عادی نہیں۔

عبرت کے بعد عشرت نے قصہ کو کس طرح آگے بڑھایا اور ان کے سامنے کونسی مثنوی تھی اس بارے میں عشرت کچھ نہیں کہتے البتہ ڈاکٹر گیان چند جین کا کہنا ہے کہ عشرت نے عبدالشکور بزمی کی فارسی مثنوی پدماوت (سنہ ۱۰۲۸ھ) سے ترجمہ کیا۔ اس کی دلیل وہ یوں دیتے ہیں کہ اختلاف جو کچھ ہے وہ آخر میں ہے۔ عبرت نے جو حصہ نظم کیا وہ رازی اور بزمی دونوں کے یہاں یکساں ہے بعد میں جہاں اختلاف ہے وہاں بزمی کی پیروی کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عشرت نے بزمی سے ترجمہ کیا[1]

ایک ہی مثنوی پر چونکہ دو شاعروں کا تصرف رہا ہے اس لئے جو ناہمواری آگئی ہے وہ صاف محسوس کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر پرکاش کی تنقید یہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے عشرت کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں۔ وہ نہایت معمولی قسم کے شاعر تھے اور ترجمہ کے اصول سے نابلد تھے۔ انھوں نے پدماوت کے قصے کو اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس

---

[1] ڈاکٹر گیان چند جین۔ پدماوت اردو نظم میں۔ اردو۔ اگسٹ سنہ ۱۹۵۱ء

اس کی کوئی ادبی حیثیت نہیں [1] اس خیال کی تائید ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ان جملوں سے بھی ہوتی ہے کہ عشرت نے عبرت کے انداز بیان کو نبھانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشرت کو عبرت کی طرح زبان و بیان پر دلیسی قدرت نہ تھی۔ جو روانی عبرت کے اشعار میں ہے وہ عشرت کے یہاں نہیں ہے [2] گیان چند جین بھی اس پر مہر تصدیق یوں ثبت کرتے ہیں کہ عبرت کے بیانات شعریت کے لحاظ سے عشرت سے بہتر ہیں [3]

اس سلسلے میں یہ بات بھی لائق غور ہے کہ عبرت نے عاقل خاں رازی سے خوشہ چینی کا ذکر بھی کیا ہے اور توارد کا اعتراف بھی لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عبرت ملک محمد جائسی کا یا ان کی پدماوت کا کہیں کوئی ذکر نہیں کرتے۔ عبرت کو معلوم تھا کہ پدماوت سب سے پہلے جائسی نے لکھی۔ ہوسکتا ہے کہ عبرت نے پلاٹ تو وہی لیا جو جائسی اور رازی کا ہے لیکن اس کے متن سے استفادہ نہ کرتے ہوئے انھیں عنوانات کو اپنے طور پر نظم کیا ہے۔ برخلاف اس کے ایک محقق دلدار حسین دوسرے محققین کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یقینی طور پر عبرت کا ماخذ جائسی تھا عاقل خاں رازی نہیں۔ اپنے بیان کے ثبوت میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ عبرت کے استاد محبت خاں خود بھاکا کے شاعر تھے اور انہیں کے ذریعہ اگر عبرت کو بھی بھاکا سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے تو یہ بات عقل اور قیاس کے مطابق ہے [4]

---

[1] ڈاکٹر پرکاش مونس۔ ہماری زبان۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۷۲ء ص ۶

[2] فرماں فتح پوری۔ اردو کی منظوم داستانیں۔ ۱۹۷۱ء

[3] ڈاکٹر گیان چند جین۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ص ۳۸۷

[4] دلدار حسین۔ اردو پدماوت۔ آجکل مارچ ۱۹۶۱ء ص ۶

شمع و پروانہ کا سنہ تصنیف جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ۱۲۱۱ھ ہے۔ لیکن اس کا پہلا نسخہ کب طبع ہوا اس کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ مختلف ادوار میں مختلف مقامات سے یہ مثنوی شائع ہوتی رہی۔ اس کے کئی اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں۔ کسی نے پدماوت اردو نام رکھا اور کسی نے شمع و پروانہ۔ ۱۸۷۴ میں مطبع گلستان کشمیر بمبئی سے ۱۸۸۵ء میں اور ۱۹۲۱ء میں نولکشور کانپور (بار پنجم) سے اور ۱۹۲۸ء میں قطب الدین احمد نامی پریس لکھنؤ سے اس کے اڈیشن نکلے۔

شمع و پروانہ کے جملہ اشعار کی تعداد ۲۳۳۶ ہے۔ عبرت نے صرف ۱۳۰۳ اشعار لکھے باقی ۳۳ ۲۰۲ اشعار عشرت کے ہیں یعنی تقریباً تین چوتھائی عشرت کی فکر کا نتیجہ ہے۔ مثنوی بحر ہزج میں ہے جس کے ارکان ہیں مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔ عام مثنویوں کی طرح آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں مناجات، پھر پیر طریقت کی منقبت استاد محبت خاں کے اوصاف اور فیض اللہ خاں کی مدح ہے۔ مثنوی کے ان رسمی لوازمات کے بعد عبرت نے اپنی جدت سے ایک نئے عنوان "تعریف قلم سحر کار کی" کا اضافہ کیا ہے جس میں شاعر قلم سے سوال کرتا ہے اور قلم جواب دیتا ہے۔

ابتدائی صفحات میں ہندوستان جنت نشان کی تعریف ہے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی عشق کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پدماوت کی پیدائش سے داستان کا آغاز ہوتا ہے جو اختتام تک پہنچتا ہے۔

بتخانۂ خلیل (پدماوت)

حافظ خلیل حسن خلیل۔ مقام پیدائش مانکپور۔ جلیل مانکپوری کے برادر کلاں ہیں۔ اپنے وقت کے استاد شاعر تھے۔ امیر مینائی امیر سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کی شاعری کا چرچا لکھنؤ اور دیگر مقامات تک ہوگیا تھا۔ اسی شہرت کی بنا پر مہاراجہ بھگوتی پرشاد والی ریاست بلرام پور نے انھیں مانکپور سے بلوا کر شاعر دربار بنا لیا تھا وہاں خلیل کی حیثیت راج کوی کی تھی۔ تادم آخر اسی ریاست سے منسلک رہے۔ وہیں وفات پائی۔ دیگر اصناف سخن کے علاوہ مثنوی گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ پانچ مثنویاں نظم کیں جو ریاست کی طرف سے سنہ ۱۹۱۴ء م سنہ ۱۳۳۲ھ میں "پنجۂ نگارین" نام سے مطبع مفید آگرہ سے شائع ہوئیں۔

۱۔ بتخانۂ خلیل (پدماوت جائسی) ۲۔ بتکدۂ خلیل (طبعزاد)
۳۔ دشینت شکنتلا (کالیداس) ۴۔ میگھ دوت (کالیداس)
۵۔ فیروز سلمیٰ (طبعزاد)

ان میں پہلی مثنوی بتخانۂ خلیل ملک محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم ترجمہ ہے جو ہماری اس کتاب کا عنوان ہے۔

اس مثنوی کے ٹائٹل کی عبارت یوں ہے:

پہلی مثنوی

بُتخانۂ خلیل

نتیجۂ فکر

جناب حافظ خلیل حسن صاحب المتخلص بہ خلیل

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمّد قادر علی خاں صاحب طبع شد

سنہ ۱۳۳۲ھ سنہ ۱۹۱۴ء

یہ مثنوی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد دو ہزار دو سو بیالیس ہے جہاں تک ماخذ کا سوال ہے کتاب کے آغاز میں داخلی شہادت ملتی ہے کہ خلیل نے ملک محمّد جائسی کی داستان پر اپنی مثنوی کی بنیاد رکھی ہے۔ عبرت کے منظوم ترجمہ سے بھی وہ واقف تھے۔ کہتے ہیں:

نیا گرچہ کوئی یہ قصا نہیں ۔۔۔ مرا خاص کوئی یہ حصا نہیں

ملک یہ فسانہ بیاں کر چکا ۔۔۔ وہ بھاکے میں اسکو عیاں کر چکا

جو کچھ بچ گیا اس سے اور رہ گیا ۔۔۔ تو اردو میں عبرت اُسے کہہ گیا

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جائسی کی پدماوت بھی ان کے پیش نظر رہی ہے اور وہ مثنوی بھی جو شمع و پروانہ کے نام سے عبرت و عشرت نے منظوم کی۔ گمان غالب ہے کہ خلیل اودھی بھی جانتے تھے کیوں کہ ان کے ذخیرہ کتب سے (جو ورثہ میں مجھے ملا ہے) مجھے جائسی کی وہ کتاب بھی ملی ہے جو ہندی رسم خط میں ہے اور جس کے حاشیہ پر ان کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ اس کتاب کا حوالہ ان کے ایک اور شعر میں بھی ملتا ہے۔

اب آگے ہے یہ داستاں اس طرح

ملک نے کیا ہے بیاں اس طرح

جائسی کی پدماوت

خصوصیات

جائسی کی پدماوت کی خصوصیات

تجزیۂ خلیل کے مکمل مطالعہ سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خلیل نے اصل پدماوت سے کتنا گریز کیا ہے اور عزت و عشرت نے کیا انداز اختیار کیا ہے چنانچہ جائسی کی پدماوت کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ کئی عنوانات کے تحت اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ تصوف و معرفت

جائسی کی پدماوت درحقیقت تصوف و معرفت کا سرچشمہ ہے جو اس کی شہرت کا ایک اہم عنصر ہے۔ ملک کے عہد میں مذہبیت جائس میں غالب تھی اور تصوف بھی اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکا تھا جائسی نے آنکھ کھولی ارادت اور عقیدت مندی کی آغوش میں۔ پروان چڑھے تصوف کے سایے میں اور جان دی دونوں کے آستانے پر یہی وجہ ہے کہ مذہب اور تصوف دونوں کی جھلک ملک کی تمام تصانیف میں نمایاں پائی جاتی ہے[1]۔ ان کی پدماوت بھی جو بظاہر عشقیہ مثنوی ہے اس کی داستان تصوف کے سہارے آگے بڑھی ہے۔ ملک نے عشق مجازی کے پلاٹ میں ایسے سچویشن فراہم کئے ہیں جن میں تصوف کے نکات، معرفت کے اسرار اور سالکان طریقت کے منازل و معاملات کی تشریح کی ہے صوفی مسلک اور اس کے اصولوں کو ایک عشقیہ کہانی کے پلاٹ میں پیش کیا ہے۔ یعنی

ایک راجکمار کسی راجکماری کی خوبصورتی سن کر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے جوگی بن کر نکلتا ہے مشکلات اور بلاؤں کے تھپیڑے سمندر پار

---

[1] سید کلب مصطفےٰ۔ ملک محمد جائسی ۱۹۴۱ء

کرنے کے بعد اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن مصیبتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ اس کو اس کے مقصد سے دُور رکھنا چاہتی ہیں۔ ان پر قابو پانے کے بعد ہی دونوں کا ملن ہوتا ہے۔ ملک اس تعلق سے خود لکھتے ہیں۔

"میں نے اس کے معنی پنڈتوں سے سمجھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو اس کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا کہ ہفت طبق آسمان اور ہفت طبق زمین انسان کے جسم میں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نظم میں تن سے چتوڑ۔ روح سے رتن سین دل سے سنگلدیپ۔ پدماوت سے معشوق حقیقی۔ توتے سے مرشد ناگمتی سے دنیا۔ راگھو سے شیطان۔ علاؤ الدین سے ہوا و ہوس مراد ہیں۔ اس کو محبت کی کہانی سمجھو یا جو کچھ چاہو شمار کرلو۔ جو اس کو سنے گا۔ محبت حاصل کرے گا۔ میں نے خونِ جگر کر کے اس کو جوڑا ہے۔ راہِ محبت میں میری آنکھیں بہتی آنسو ہیں اور میں نے یہ جان کر یہ کتاب لکھی ہے کہ یہ میرے واسطے یادگار کا ذریعہ رہے گی۔" [1]

اس نقطہ نظر سے مثنوی کو پڑھا جائے اور غور و تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہو کہ اس میں جگہ جگہ امراض روحانی سے خبرداری ہے۔ حصول عرفاں کے نسخے ہیں سالک طریقت کے منازل و مراحل کے نشان کے لئے جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کی سیر کرائی ہے۔ سنگلدیپ سے چتوڑ گوھ کی طرف واپسی فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کی تمثیل ہے۔ [2]

---

[1] شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی۔ ۱۸۶۱ء۔ ص ۶۲۔

[2] امیر احمد علوی۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت۔ نگار جولائی ۱۹۲۶ء ص ۲۶

پدماوت کا رُوپ چونکہ عشقیہ کہانی کا ہے اس لیئے صوفی مسلک و روایات کی باتیں واقعات کے بیچ بیچ میں شامل کردی گئی ہیں۔ مثلاً

رتن سین توتے سے پدمنی کے حسن وجمال کا ذکر سن کر نادیدہ عاشق ہوجاتا ہے اور راج پاٹ چھوڑ اس کے لئے جوگ اختیار کرتا ہے۔ اس بیان میں جائسی نے معرفت کی چنگاری یوں ڈالی ہے۔

"توتے کی باتیں سن کر (جو مرشد کامل ہے) راجہ کو ہوش آیا۔
دل کی روشنی میں نورانی بہشت (سنگلدیپ) دکھائی دی۔
دُنیا اس کی نگاہ میں تاریک ہوگئی۔ راجہ کی نظریں دولت دنیا سے فوراً پھر گئیں۔ اس دُنیا کو ناپائیدار سمجھ لیا۔ جب اپنا محبوب ہی اپنے قبضہ میں نہیں تو چاہے دُنیا آباد ہو یا ویران مفارقت کی چنگاری مرشد کامل نے ڈال دی جو اس کو بڑھائے ہوا دے وہی مرید و معتقد ہے۔ اب مثل پتنگا بھونرے کی صورت اختیار کروں گا۔" [۱]

اسی طرح وصال کے ذکر میں بھی درس معرفت کے چھینٹے کس استعاراتی پیرایہ میں دیئے ہیں۔

"نوخیز پدماوت نے عاجزی سے کہا بہترین خوبصورت طرح ہے شراب نوش کیجئے بحکم محبوب بسر وچشم قبول کروں گی۔
جو فرمائش ہوگی بجالاؤں گی لیکن اے پیارے میری ایک بات سن کہ شراب محبت (بادۂ عرفاں) کا مزہ تھوڑا تھوڑا پیں۔ شراب محبت کا مزہ اسی میں ہے کہ کسی کو گمان نہ ہو کہ کس نے دیا اور کس نے نوش کیا۔ شراب انگوری کا پینا ایک بار کافی ہے۔ دوبارہ پینے سے نشہ بے قابو

---

[۱] شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی۔ سنہ ۱۸۶۱ء ص ۱۳، ۱۴، ۲۴

ہو جاتا ہے جس نے ایک بار شراب پی کر صبر کیا اس
نے زندگی کا مزہ اور شراب کی لذت پائی" [1]

یا تو تا جب پدماوت کے پاس آ کر اس کے لئے رتن سین کے جوگ لینے کا
حال کہتا ہے اور طنز کرتا ہے کہ تو ایسی بے درد ہے کہ اس کی بات بھی نہیں پوچھتی
تو پدماوت جواب دیتی ہے۔

"اگر میں چاہوں تو اس سے آج ہی مل سکتی ہوں لیکن اسرار
محبت کی گہرائی دی جاتا ہے جو اس میں ڈوب کر فنا
ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ ابھی کچا ہے کیوں کہ ہنوز
محبت کا رنگ اس پر نہیں چڑھا۔ جو شخص ابھی تک بھونرے
کے رنگ میں نہیں ہوا۔ جو آفتاب ہو کر آسمان پر نہیں
چڑھا۔ جس شخص کا خوف ابھی دل سے نہیں گیا وہ کامل
نہیں ہوا۔ میں اس کی پیاس کیا بجھاؤں" [2]

اس قسم کے مکالموں سے یہ عشقیہ مثنوی بھری پڑی ہے۔ اس کے جستہ جستہ
نمونے یہ ہیں:

"اے راجا تو نے گدڑی کیا پہنی۔ تیرے جسم میں کوئی راستے
(حواس) شہوت، غصّہ، حرص، گھمنڈ، ثروت ہیں۔
یہ پانچوں راہزن جسم کو آزاد نہیں چھوڑتے جسم میں نقب
لگا دیتے ہیں اور راتوں رات مشعل جلا کر گھر لوٹ لیتے ہیں"۔

"تو ہوس کو قابو میں رکھ۔ نفس پر قبضہ کر۔ اگر مرنا ہی ہے
تو خود کو مٹا دے ظاہر میں دنیا داری کر اور باطن کو محبوب سے

---

[1] [2] شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی ۱۸۶۱ء ص ۲۱۹، ۲۱۳، ۲۲۰

بِلادے۔ خودی اختیار کر کے تو نے دانشمندی کھودی۔
تو نے خودی کو مٹا دیا تو سب کچھ ہے۔ اگر ایکبار بھی مرنا سیکھا
تو پھر موت سے مرنے والا اور مارنے والا کون ؟ تو خود
مرشد ہے اور تو ہی مرید۔ سب کچھ آپ ہے اور تنہا
بھی آپ ہے۔"

"جو مجبور ہوتا ہے وہ آگ پر نظر نہیں کرتا۔ آگ کے مقابل
ہو کر جل جاتا ہے۔ پیٹھ نہیں پھیرتا۔"

"عشق کی راہ تیس ہزار کوس دراز ہے اور ایسی باریک ہے
کہ چیونٹی نہیں چل سکتی۔"

"آخر کار یہ بدن خاک ہو جائیگا اور مرنے کے بوجھ سے
مٹی فربہ ہو جائے گی۔"

"میں رانی پدماوت ہوں اور ساتویں آسمان پر میرا مقام ہے۔
اس کے ہاتھ لگوں گی جو اپنے آپ کو پہلے فنا کر دے۔"

۲۔ فوق الفطرت عناصر اور دیومالا

جائسی کی پدماوت میں فوق فطرت عناصر بھی ہیں اور دیومالائی کردار بھی
انھیں کے سہارے پلاٹ کو پھیلایا ہے اور آگے بڑھایا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا
جا چکا ہے کہ پدماوت کی داستان پورے طور پر طبعزاد نہیں۔ انھوں نے مروج
داستانوں، لوک کتھاؤں اور نیم تاریخی واقعات سے اس کے تانے بانے
بنتے ہیں۔ ہمارے دَور اول کی داستانوں میں بھی انھیں عناصر کا زور شور نظر آتا
ہے۔ سحر البیان اور گلزار نسیم اس کی مثال ہیں۔ شاید سبب اس کا یہ ہو کہ انہی
محیر العقول باتوں کی وجہ سے قصّہ دلچسپ بنتا ہے اور انھیں کی وجہ سے

تحیر و تعجب میں اضافہ ہوتا ہے۔ سحرالبیان کے پلاٹ میں کے مختلف اجزا یعنی نجومیوں کی پیشین گوئی، کل کا گھوڑا، پری اور دیو وغیرہ دوسری داستانوں میں بھی ملجاتے ہیں۔ یہی حال جائسی کی پدماوت کا بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے ہندی دیومالائی عناصر سے بہت کام لیا ہے۔

ملک محمد کو ہندوؤں کی روایات اور ویدوں سے متعلق درسی اور خارجی معلومات تھیں۔ گریرسن نے چندریکا کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جائس آکر ملک محمد نے سنسکرت عروض اور زبان کی واقفیت پنڈتوں سے حاصل کی تھی۔ سنسکرت کے اشلوکوں اور پرانوں کے کرداروں سے خاصی جانکاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو تلمیحات کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔ مثلاً

> "توتے نے راجا سے کہا ــــ اے راجہ تو اقبال میں راجہ بکرم ہے اور ہریشچندر کی طرح راستباز۔ تو تو ریاضت میں گوپی چند سے بھی بڑھ گیا۔ اور مفارقت میں بھرتری سے بھی بازی لے گیا۔ تجھے گورکھناتھ نے کمال عطا فرمایا تھا اور گرو مچھندرناتھ نے دستگیری کی تھی۔"

> "اب اگر تو آفتاب کی طرح آسمان پر چڑھ جائے اور راہو بن جائے تو چاند کو پا سکتا ہے۔ اس طرح بہت سے لوگ جان پر کھیل چکے ہیں۔ صرف تو ہی نہیں بکراجیت محبت کے دروازے میں گھسا اور سپنا دت کے عشق میں تحت الثریٰ کو گیا۔ کھنڈرادت کے عشق میں راجہ بھوج بیراگی ہو کر گگن پور تک گیا اور مرگاوتی کے لئے جوگی بنا۔ کنور نے کھنڈرادت پر فریفتہ ہو کر جان دی۔ مادھو نے مالتی کی جدائی برداشت کی۔ راجہ سرپادت کیلئے

چنانچہ جل گیا اور اوکھا کے لئے تیار ہیں پڑے۔"

"احمق ہے وہ جس نے گھر کی عورت پر عمل کیا۔ رام سیتا کو ازراہ محبت اپنے ساتھ رکھتے تھے اس نے راون کا ساتھ دیا۔ راجہ بھرتری کے گھر میں سولہ سو رانیاں تھیں اور سر پستان سے اس کے تلوے سہلاتی تھیں۔ جب وہ جوگی ہوا تو کس نے اس کا ساتھ دیا؟"

"قلعہ پر چڑھتے ہوئے جب جوگی رتن سین پر آفت آئی تب مہادیو کا آسن اپنی جگہ سے ہلا۔ اس نے ہنس کر اپنی بیوی پاربتی سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آج جوگی کے قتل کا سامان ہے۔ پاربتی یہ سن کر مہادیو کے چرنوں میں گر پڑی اور کہا اے مہادیو چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔ اور تب مہادیو اور پاربتی اپنا بھیس بدل کر جوگی کے پاس آئے۔"

"رتن سین مہادیو کو الزام دیتا ہے۔ اے ملیچھ دیو! کس قدر میں نے تیری پوجا کی۔ مبارک جان کر تیرے قدم پکڑے لیکن تو میرے حق میں تو تے جیسا ہو گیا۔ سچ ہے پتھر خدمت سے کہاں پسیجتا ہے۔ اسے کتنا ہی تر کیا جائے تمام عمر سبز نہیں ہوتا۔ میں دیوانہ تھا جس نے اے مہادیو تجھے پوجا۔"

"رتن سین جب سمندر میں آیا اور کٹار نکال کر اپنی گردن کاٹنا چاہا، اتنے میں سمندر برہمن کی صورت بنا کر ظاہر ہوا ماتھے پر تلک چودھویں رات کے چاند کی طرح تھا۔ ہاتھ میں سونے کی ہسیا تھی۔ کانوں میں مندرے اور

جینوا کا ندھے پر۔ آگے یہ بات کہی اے کنور مجھ سے
باتیں کہہ۔ کس واسطے اپنے قتل پر تو آمادہ ہے۔"

۳۔ تفصیلات و جزئیات

جائسی نے اپنی داستان کے بہت سے مقامات پر بڑی تفصیلات و جزئیات سے کام لیا ہے۔ مثلاً سراندیپ شہر اور اس کی عمارتوں کا بیان، راجاؤں کی شان و شوکت، باغ کی سجاوٹ، پھولوں کے اقسام، زیورات اور بناؤ سنگار کے لوازمات کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ مثلاً

عورتوں کے بناؤ سنگار کے ذکر میں جائسی سولہ سنگار کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ بدن میں ابٹن لگا کر غسل کرنا۔ جوڑا باندھنا، مانگ میں سیندور بھرنا، ہاتھوں میں کگن۔ گلے میں مالا، کان میں حلقے، ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی، بعول پرستی کی دھڑی اور کمر میں کمر دھنی وغیرہ۔

علاؤ الدین سلطان کے سامنے راگھو برہمن پدماوت کا سراپا کھینچنے سے پہلے پنڈتوں کے شاستروں کے مطابق عورتوں کے اقسام اور ان کی صفات کا ذکر یوں کرتا ہے:

"سر اور پاؤں ہتھنی کے موٹے ہوتے ہیں۔ گردن چھوٹی سینہ تنگ۔ کمر موٹی مثل ہاتھی کے بیخوف۔ گینڈے کی چال۔ غیر مرد پہ مائل۔ خوراک بہت، صفائی پاکیزگی کم۔ شوقین مزاج۔ سانس میں بدبو۔ خیالات بد مانند دیو کے۔
سنکھنی۔ قوت بہت، خوراک کم۔ سینہ چوڑا اور فربہ۔ کمر باریک۔ مغرور۔ نڈر۔ غصہ آور۔ اپنی صورت پر فریفتہ چال شیر کی۔ قدم ڈھیلے۔ کھال جسم کی موٹی۔ شوہر کے

پاس جانے تو سینے میں ناخن گاڑ دے۔ چنچل۔ دانا۔ محبت والی۔ نہایت حسین۔ مزاج میں صفائی۔ ہنس مکھ۔ اطاعت گزار۔ چاند کا سا بدن۔ کنول کی طرح گوری۔ چال اس کی ہنس جیسی۔ پان اور پھول کی دلدادہ۔ رنگ کمد کا پھول۔ پدمنی۔ پدم کا سا رنگ۔ بدن پدم جیسا خوشبودار۔ قد نہ بہت لانبا اور نہ بہت چھوٹا۔ نہ بہت دبلی اور نہ موٹی۔ چار چیزیں اس میں دراز اور چار کوتاہ۔ سولہ صفتوں میں کامل۔ سولہ سنگار میں پوری ؎

یا جب پدماوت مہادیو جی کے مندر کو جاتی ہے تو چھتیس قوم یا ذات کی عورتیں اس کے ہمرکاب رہتی ہیں۔ اُن کی تفصیل جائسی نے بڑے خوبصورت انداز سے دی ہے۔

"برہمنیاں نزاکت سے ہزار بل کھاتی چلیں۔ اگر وال عورتیں مثل ہاتھی کے مستانہ چال چلیں۔ دیش ناریاں مانند ہنس کے قدم رکھتی تھیں۔ چوہان عورتیں پازیب جھنکارتی چلیں۔ ٹھٹھیرن سب بن ٹھن کے چلیں اہیرن کاجل آنکھوں میں لگا کر بڑھیں۔ گوجری دودھ لے کر ٹھمکتی چلیں مالنیں ہار گوندھ کر چلیں۔ کلوارنیں شراب محبت سے سرشار تھیں۔ تنبولنیں پان کا بیڑا منہ میں رکھ کر چلیں۔ لوہارنیں بانکی نگاہ لئے، بنیا عورتیں مانگ میں سیندور بھرے رنگریزن لال سُرخ ساریاں پہنے اور نٹنیاں ہنستی گاتی اور ناچتی چلیں"۔

باغ کے پھلوں اور پھولوں کے اقسام اتنے گنائے ہیں۔

"نارنگی۔ لیموں سنگترے۔ بادام۔ انجیر۔ انار انگور

کشمش، سیب، ہرفار یوڑی، شہتوت، کروندا، بیر
چرونجی، کیوڑا، چنپا۔ چنبلی، ناگیسر، گیندا، پارسنگار
سیوتی، مدمالتی، جوہی، سوسن اور بیلا وغیرہ۔
یا مہیشور جب جوگی کے بھیس میں رتن سین کے پاس آتے ہیں :
"جسم پر ہڈیوں کی گدڑی۔ گلے میں آدمیوں کے سروں
کی مالا۔ بدن پر بھبھوت۔ گلے میں اژدھے کا ہار۔
ہاتھی کی کھال اوڑھے۔ پہنچوں میں گنے کی مالا۔ ماتھے
پر چاند کا تلک اور ہاتھ میں گھنٹی۔"

۴۔ نازک خیالیاں :

جائسی کی پدماوت کا ایک اور علمی و ادبی وصف اس کی شاعرانہ نازک خیالیاں ہیں۔ یہ نزاکت فکر اور پرواز خیال جائسی نے سنسکرت ادبیات عالیہ کے مطالعہ سے حاصل کی ہے۔ یہاں چند مثالیں بطور نمونہ دی جاتی ہیں تاکہ جائسی کے انداز فکر کا اندازہ ہو۔

"چیتا اس کی کمر کے آگے ہار گیا اور جنگل میں رہنے لگا۔"
"اے بھونرے اور اے کوے! میرا پیغام شوہر سے اس طرح
کہو کہ وہ عورت آتش مفارقت میں جل کر مر گئی اور اس
کے دھوئیں سے ہم سیاہ ہو گئے۔"
"میں اس جسم کو جلا کر خاک کر دوں گی اور ہوا سے کہوں
گی کہ اس خاک کو اڑا دے۔ شائد میری خاک اڑ کر اس
راستے میں پڑ جائے جہاں محبوب اپنے قدم رکھتا ہو۔"
"ہنس پانی بھرے ہوئے تالاب میں رہتا ہے اور خشک

ہو جانے پر چھوڑ دیتا ہے لیکن کنول کا پھول اپنے محبوب کو نہیں چھوڑتا۔ خواہ تالاب میں کیچڑ ہی رہ گیا ہو۔"

"پدمنی کی خواصیں جب سیندوری ساڑیاں پہن کر خراماں خراماں چلیں تو ایسا معلوم ہوا کہ تمام روئے زمین پر چراغ جل گئے۔"

"میں جس پر نگاہ ڈالتی ہوں اسی جگہ وہ جان دیدیتا ہے اسی خوف سے میں نکلتی نہیں کہ خون ناحق کا عذاب کون اپنے سر لے۔"

"سیج ایسی نازک بچھائی گئی تھی کہ کوئی چھونے نہیں پاتا تھا جو کوئی دیکھے اس کو تو بار نگاہ سے لغزش کرے پاؤں دھرنا کیا۔"

"میں کس کے ذریعہ اپنے بچھڑے شوہر کو پیام بھیجوں۔۔ جس پرندے کے نزدیک کھڑی ہو کر حال کہتی ہوں وہ میرے ہجر کی آگ سے جل جاتا ہے۔"

عورت اور زمین تلوار کی لونڈی ہیں۔ جو تلوار کے زور سے جیتے اسی کی ہیں۔"

"چاند اور سورج میں جو پدماوت جیسی روشنی ہوتی تو دن پہاڑ ہو جاتا یعنی کاٹے نہ کٹتا اور رات کبھی ہوتی ہی نہیں۔"

"بھونرا جس نے مانسرور کی ہمت باندھی تب اس نے کنول کا رس لیا گھن (کیڑا) جو اس کی جرأت نہ کرسکا اس کی غذا کا دارومدار چوب خشک ہی پر رہا۔"

جائسی کی پدماوت سے مترجم کا انحراف

ملک محمد کی پدماوت کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر خلیل کے ترجمہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندی پدماوت کی بعض خصوصیات کو نظر انداز کیا ہے۔ مثلاً تصوف و معرفت کا عنصر جو جائسی کی پدماوت کا اہم گوشہ ہے اس سے بُتخانۂ خلیل یکسر عاری ہے۔ انھوں نے اس عنصر سے انحراف کر کے اپنی مثنوی کو مکمل طور پر عشقیہ مثنوی بنا دیا ہے اور اب یہی اس مثنوی کی خصوصیت قرار پاتی ہے۔ جہاں جہاں اصل مثنوی میں ایسے مواقع آئے تھے انھوں نے اس سے صرف نظر کر کے پلاٹ کے واقعات کو اس طرح جوڑا ہے کہ کہیں جھول آنے نہیں دیا۔ "شمع و پروانہ" میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی ہے۔

تفصیلات و جزئیات پر بھی خلیل نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ ان کے یہاں اگرچہ بڑی حد تک میر حسن کی سحر البیان کی تقلید ملتی ہے لیکن یہ زیادہ تر زبان و بیان اور اسلوب کی حد تک ہی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جائسی میر حسن، یا گلزار نسیم کے ادوار کی مبالغہ آرائی اور تصوراتی خیالی اجزا سے مثنوی کی آراستگی کی صنعت خلیل کے زمانے تک دور از کار ہو گئی تھی اور داستانوں کو حقیقت سے قریب لانے کا انداز چل پڑا تھا۔ البتہ کہیں کہیں باغ کے پھولوں یا زیورات اور سنگار کے لوازمات کا بیان قدرے تفصیلات سے ملتا ہے۔

نازک خیالیوں سے انحراف کا سبب بھی انتضائے زمانہ ہے۔ شاعری سادگی کی طرف مائل تھی۔ اس کے علاوہ جائسی کی نازک خیالیوں کی جو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ اس سے عہد میرا

ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ عام مثنویوں کی روش اختیار کی گئی۔ خلیل نے جائسی سے صرف داستان اور ان کے ذیلی عنوانات لئے ہیں۔ اسلوب و بیان ان کا اپنا ہے
جہاں تک دیومالائی عناصر کے برتنے کا سوال ہے۔ جائسی کے اس عنصر سے بھی خلیل نے مکمل طور پر گریز کیا ہے۔ البتہ توتا جو داستان کا اہم کردار ہے اور جسے کسی صورت میں خارج نہیں کیا جا سکتا تھا برقرار رکھا ہے۔ اس ایک کردار سے قطع نظر بتخانۂ خلیل میں کوئی اور دیومالائی کردار نظر نہیں آتا۔ جہاں کہیں پلاٹ کو آگے بڑھانے میں دشواری پیش آئی ہے خلیل نے دیوی دیوتاؤں کے نام تبدیل کر کے انسانی کرداروں کو ان کی جگہ دیدی ہے۔ مثلاً سمندر کے دیوتا اور اس کی لکشمی کی جگہ (جو رتن سین اور پدماوت کو سمندر کے طوفان سے بچاتے ہیں) انھوں نے ایک درویش مرد اور اس کی دختر کو دی ہے۔ اس طرح اس تبدیلی سے پلاٹ پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔
جائسی کی پدماوت کے اس عنصر کو "شمع و پروانہ" میں عبرت وعشرت نے نبھایا ہے مثلاً پاربتی راجہ رتن سین کی محبت کا امتحان لینے کے لئے اپنی صورت پریوں کی سی بنائی ہے اور مسکراتی ہوئی راجہ کا دامن پکڑ کر کہتی ہے اے راجہ میری طرف دیکھ جو حسن مجھ میں ہے کسی میں نہیں۔ اگر تم میری بات مانو گے تو تم کو شیولوک تک پہنچا دوں گی۔ تپ اور جوگ چھوڑو اور میرے ساتھ دائمی آرام کے لئے چلو۔ عبرت لکھتے ہیں۔

کہ بہر امتحانِ عاشق زار	بنا گوری نے شکل اپنی طرحدار
کہا اب ترک دلسے کر گدائی	کہ بخشوں گی میں تجھکو بادشاہی
نہ کھو تو یہ جوانی اے گل اندام	چل اب کر جی سے باہم عیش و آرام

یا جب پدماوت کا باپ راجہ گندھرپ سین رتن سین کو قتل کا حکم دیتا ہے تو سدا شیو ایک برہمن کے لباس میں اس کی مدد کو آتے ہیں۔

سداشیو نے سنایہ کچھ زبانی　　کہ جلّادوں کو آیا حکم ثانی
عیاں دربار میں راجہ کے آکے　　سداشیو نے دعا دی دست چپ سے
جو بے دستور واں پامھن کو دیکھا　　ہوا درباریوں کو اک پریکھا

یا جب پدماوت کی کشتی طوفاں کی نذر ہو جاتی ہے اس وقت سمندر کی بیٹی لچھمی اس کی مدد کرتی ہے۔

پدم کا اس میں تختہ بہتے بہتے　　نہیب موج دریا سہتے سہتے
تلاطم میں گیا بہہ اکطرف کو　　کہ تھا نزدیک جس کے ایک ٹاپو
وہاں کا تاجور تھا خود سمندر　　سوا اس دم اتفاقاً اس کی دختر
لب دریا برائے سیر ناگاہ　　گئی تھی لڑکیوں کے ساتھ دماہ

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جائسی کے یہاں دیومالائی کردار و تلمیحات کی کثرت ہے جسے کسی حد تک شمع و پروانہ میں برتا گیا تھا لیکن خلیل نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔

تقابلی مطالعہ

خلیل حسن خلیل نے جائسی کی کہانی اور اس کے پلاٹ کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے ان کے عنوانات قائم کئے ہیں۔ جائسی کی پدماوت میں یہ ذیلی عنوانات (۴۷) ہیں جب کہ خلیل نے صرف (۲۷) عنوانات کے نام دیتے ہیں۔ بتخانۂ خلیل بیسویں صدی کی تصنیف ہے۔ اس وقت تک اردو زبان نہایت آراستہ و پیراستہ ہو چکی تھی۔ نوک پلک درست کئے جا چکے تھے اس لیے خلیل کی پدماوت کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ بندشیں چست اور محاورات با مزہ ہیں۔ رعایت لفظی کے استعمال نے اشعار کی لطافت کو دو بالا کیا ہے۔ خلیل نے میر حسن کے بیان کی فصاحت اور بندش کی چستی تو لی ہے لیکن غریب اور نامانوس الفاظ کو قریب نہیں آنے دیا ہے۔

شمع و پروانہ، میر حسن کی سحر البیان کے ۱۲ سال بعد لکھی گئی لیکن آئندہ سطور میں جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہوگا اس سحر البیان سے بھی قدیم معلوم ہوتی ہے۔ زبان صاف نہیں بیان مبہم ہے۔ روز مرہ وہی قدیم ہے متروک الفاظ آوے، لوہو، نت، ولیکن رکھیو۔ زبس، دلے، وگرنہ، ادھر ادھر۔ کرے ہے، کبھو، انھوں سے وغیرہ کا استعمال بہت ہے۔ خلیل نے زبان کی چاشنی بڑھانے کے لیے بحر متقارب استعمال کی ہے۔ یہ وہی بحر ہے جو میر حسن کی مثنوی کی ہے۔ بہت سی مشہور عشقیہ مثنویاں اسی بحر میں لکھی گئی ہیں۔ فارسی میں فردوسی کا شاہنامہ، نظامی کا سکندر نامہ اور سراج کی بوستان خیال اسی بحر میں ہیں۔ خلیل کی پدماوت پر میر حسن کے اوصاف بھی صاف

نظر آتے ہیں۔ مثنوی کی شروعات یعنی حمد کے اشعار میں یہ مماثلت دیکھئے،

بتخانۂ خلیل	سحر البیان
جو چاہا لکھوں حمد اُٹھا کر قلم	کروں پہلے توحید یزداں رقم
گرا ہاتھ سے تھرتھرا کر قلم	جھکا جس کے سجدے میں اول قلم
سمائی یہ دہشت جگر پھٹ گیا	سر لوح پر رکھ بیاض جبیں
اُٹھائی وہ خفت کہ کٹ کٹ گیا	کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
ثنا اس کی کوئی کرے کیا مجال	قلم پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا
کوئی حمد کا دم بھرے کیا مجال	ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا
یہ تعریف ہے اختیاری کہاں	نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک
کہاں آدمی حمد باری کہاں	تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک
یہاں پاؤں ارکان کا لنگ ہے	پرستش کے قابل ہے تو اے کریم
فرشتوں کا بھی حوصلہ تنگ ہے	کہ ہے ذات تیری غفور و رحیم

شمع و پروانہ کے ابتدائیہ میں عبرت نے مثنوی منظوم کرنے کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں اپنے مذاق سخن کا ذکر کیا ہے کہ وہ معیاری مثنوی منظوم کرنا چاہتے ہیں اس لیے اُسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور سخن کو شیریں بنانے میں بڑی جانکنی کی ہے۔ اس آرزو کا بھی اظہار کیا ہے کہ صاحب ہوش اُسے سن کر ہمہ تن گوش ہو جائیں اور ان کے قلم کی لغزشوں کو درگزر کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیل کے پیش نظر عبرت کے یہ اشعار رہے ہیں کیوں کہ انھوں نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ یہ مثنوی ان کی پہلی کاوش ہے۔ قارئین سے بصد عجز و انکسار گزارش کی ہے کہ ان کے عیوب پر نظر نہ ڈالیں۔

بتخانۂ خلیل	شمع و پروانہ
یہ اُردو کی ساری مری مثنوی	یہ میں نے جانکنی جوں کوہکن کی

یہ پروردہ حسرت بھری مثنوی — بنائی شکل تب شیریں سخن کی
نمونہ مری پہلی جودت کا ہے — نکالی دل سے ہے آہ جگر گوں
یہ جوش ابتدائی طبیعت کا ہے — کیا ہے مصرع رنگیں کو سوز دل
مجھے ناز و فخر اس پہ کچھ بھی نہیں — جہاں میں جو کوئی ہے صاحب ہوش
مجھے دعویٰ شعر گوئی نہیں — ہوں مثل قلم سر تا پا گوش
غرض نام سے ہے نہ شہرت سے ہے — انھوں کے خدمت عالی میں ہے عرض
نہ بحث اس میں اپنی لیاقت سے ہے — اور ان پر بھی قبول عرض ہے فرض
خوشی دل کی تھی دل کو بہلا دیا — کہ ہوتی ہے خطا ہر اک بشر سے
اسی طرح دل اپنا سمجھا لیا — خصوصاً شاعر فرخندہ فر سے
یہ امید اب ذی کمالوں سے ہے — قلم کی دیکھیں جس جا لغزش یا
گزارش یہ نازک خیالوں سے ہے — نظر آئے جہاں اصلاح کی جا
کہ میری خطا دیکھیں بھالیں کچھ — رکھیں مجھ پہ نہ ہرگز حرف خالی
نظر اس کے عیبوں پہ ڈالیں نہ کچھ — بقول پاک مولانائے عالی
مروت سے انصاف سے کام لیں — بقدر وسع در اصلاح کوشند
جہاں پائیں لغزش مجھے تھام لیں — وگر اصلاح نتوانند پوشند

اس تمہید کے بعد آغاز داستان کے اشعار ہیں جن سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل کی مثنوی کیسی رواں دواں اور زبان کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔

بتخانۂ خلیل — شمع و پروانہ

مئے ناب سے جام بھر ساقیا — سمند خامۂ طوفاں بلا خیز
مجھے بھی مرید آج کر ساقیا — ہوا جوں امنگ گلگوں گرم مہمیز
بہت تو نے وعدوں پہ ٹالا مجھے — دل اس کے ساتھ با صد ترک تازی
پلا آج اپنا پیالا مجھے — لگا جوں شعلہ کرنے تیغ بازی

یہ غم جس سے میرا فراموش ہو — نہایت مضطرب دل کو جو پایا
طبیعت بڑھے دل کو اک جوش ہو — یہ تصدیق نے اس کو کہہ سنایا
فسانہ جو بھاکے کا مشہور ہے — کہ تھا ہندوستاں میں اک مہاراج
یہ حال اس میں اس طرح مذکور ہے — ہر اک شاہ وگدا کے فرق کا تاج
کہ تھا ایک راجا سراندیپ میں — سراندیپ اس کے پایہ تخت کا تھا
نرالا تھا اخلاق و تہذیب میں — سپہر اک چتر اس کے تخت کا تھا
امارت ریاست لیاقت میں فرد — سریر آرائے ملک شادکامی
جو سیرت میں یکتا تو صورت میں فرد — جوانمردی سے گندھرب سین نامی

اس بیان کو آگے جاری رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عنوانات کے تحت خلیل کی پدماوت کا جائزہ لیا جائے اور جہاں ضرورت ہو تقابلی مطالعہ کے اشعار بھی درج کر دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی زیادہ تر یہ التزام بھی رکھا ہے کہ جن واقعہ سے متعلق مثنوی کے اشعار پیش کئے جا رہے ہوں اس سے متعلق جائسی کی پدماوت کا متن بھی مختصراً درج کر دیا جائے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوگا کہ جائسی کا انداز فکر کیا ہے دوسرے اس بات کا بھی علم ہو جائے گا کہ اصل متن سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔

پدماوت کا اپنی سکھیوں کے ساتھ تالاب میں غسل کرنا:

پدماوت بہار کے موسم میں باغ کی سیر کو نکلتی ہے۔ ہمجولیاں اس کے ساتھ ہیں۔ باغ کی سیر کر کے سب کی سب تالاب میں نہانے کے لیے اترتی ہیں۔ جائسی نے یوں نقشہ کھینچا ہے:۔

"ایک دن پدماوت کے جی میں آئی کہ باغ کے تالاب میں غسل کیا جائے۔ سکھیوں کو بلایا۔ مثل گلزار سب حاضر ہوئیں۔ کوئی چنپا، کوئی کیتکی، کوئی بیلا۔ کوئی گلاب، کوئی سوسن، کوئی جوہی۔ سب کے

ساتھ لیکر تالاب کے نزدیک آئی۔ گھونگھٹ دور کرکے بال بکھرائے ناگن جیسی زلفوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آفتاب کی روشنی چھپ گئی۔ رات ہو گئی۔ ستارے نکل آئے۔ چاند طلوع ہو گیا۔ چکورہ چاند کو بھول گیا۔ پدماوت کی طرف مڑ گیا۔ مانسر تالاب نے کہا کہ جب پارس کا ساروپ لیکر اس میں رانی بیٹھی تو جو چاہا میں نے پایا۔ پانی ہیرا اس کی قدمبوسی سے پاک ہو گیا ہوا کے چلنے سے خوشبو بدلوں کی اٹھنے لگی سردی آگئی گرمی فرد ہو گئی"

بتخانۂ خلیل

ہوا بھا گئی وہ فضا بھا گئی
دِلوں میں نہانے کی لہر آ گئی
پہن کر گریں ساریاں نہر میں
ہوئیں جا کے جلوہ کناں نہر میں
کنارے کوئی اس کے اندر کوئی
سکھانے لگی بال دھو کر کوئی
جھٹک کر لٹیں دوش پر ڈالدیں
ادھر ڈالدیں، کچھ ادھر ڈالدیں
سنور وہ آب اس کا سارا ہوا
اُٹھا بلبلا جو ستارہ ہوا
چھپا ساریوں میں نہ ان کا بدن
لپٹ کر وہ جلدِ بدن ہو گئیں
برہنہ وہ سب سیمتن ہو گئیں

شمع و پروانہ

یہ سیر باغ کو ہے کون آتا
نہیں گل جامہ میں پھولا سماتا
عماری سبز سے نکلی وہ باہر
شفق سے جس طرح خورشید انور
چلی گلشن سے وہ گلرو شتاباں
برائے غسل سوئے بحر جوشاں
پہنچ کر آگے پیچھے پری پیرو
لب دریا پہ جیسے شکل آہو
قدم اکبار جا دریا پہ گاڑا
گریں دریا میں وہ سب کھولکر بال
کئے پر تاب ہر جانب بھنور جال
فلک سے ماہ کرتا تھا اشارے
کہ برج حوت میں اُترے ہیں تارے

پری بن گئی پدمنی اور بھی — سرِ دریا پہ چہرے ان کے افشاں
جو بھیگی تو وہ اٹھ چلی اور بھی — کنول کے پھول کی صورت نمایاں
عجب نور تھا جسم شفاف پر — یہ تھا افراط پانی کا رخوں پر
پھسلتا تھا پانی تن صاف پر — کہ غرقِ آب تھے لب مثلِ گوہر
کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی — تنِ گلگوں سے لگ کر قطرۂ آب
تو عکسِ بدن سے گہر ہو گئی — اتر کر بحر میں تھا مثلِ سیماب

عبرت نے لوازمات کی یکسانیت پر نظر نہیں رکھی ہے۔ باغ کے تالاب کی جگہ ایک مقام پر بحر باندھا ہے اور دوسرے مقام پر دریا۔ جہاں بحر کہا ہے وہاں اس کی صفت جوشاں رکھی ہے یعنی جوش کھاتا ہوا تلاطم سمندر جو بے محل ہے۔ اسی طرح ایک شعر میں وہ شفق اور خورشید کی تشبیہوں سے کام لیتے ہیں تو دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ ماہ فلک سے اشارے کرتا تھا یعنی ایک ہی سین میں دن اور رات کو بلا کسی دلیل کے یکجا کر دیا ہے۔

خلیل کے ان اشعار کی لطافت ہمیں بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے:

جو پانی پڑا اور بھیگا بدن — چھپا ساریوں میں نہ ان کا بدن
لپٹ کر وہ جلد بدن ہو گئیں — سی برہنہ، سب سیم تن ہو گئیں
کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی — تو عکسِ بدن سے گہر ہو گئی[1]

---

[1] ان اشعار کے ساتھ میر حسن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں کتنی مماثلت ہے۔

ہوا جبکہ داخل وہ حمام میں — عرق آگیا اس کے اندام میں
تنِ نازنیں نم ہوا اس کا کل — کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک — برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
لبوں پہ جو پانی پڑا سربسر — نظر آئے جیسے گل برگِ تر
ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس — کہے تو پڑے جیسے نرگس پہ اوس

ناگمت اور توتے کا مکالمہ :

جائسی کا بیان :۔

"راجہ ایک دن جب شکار کو گیا اس کی خوبصورت رانی ناگمت جو سارے رانیوں کی افسر تھی نہا کر نئی پوشاک پہنی اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھ کر جی میں غرور کیا۔ سرمہ لگائے ہوئے پان کھائے ہوئے توتے کے پاس آئی اور توتے سے کہا۔ اے خاوند کے چہیتے توتے سنگلدیپ کا حسن دیکھا ہے۔ سچ بتا تیری پدمنی کیسی صورت ہے۔ کیا میں حسین ہوں یا پدمنی۔ اے توتے تجھے راجا کی قسم۔ ہے کوئی دنیا میں میرے حسن کے مقابل۔"

اس واقعہ کے بیان میں خلیل نے اپنی پدماوت میں جو شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے اور جو تغزل کا رنگ بھرا ہے وہ جائسی کے بیان میں اضافہ ہے اور قابلِ داد ہے۔

بتخانۂ خلیل	شمع و پروانہ
ہوئی ایک دن صبح جب آشکارا	وہ رانی زلف اس کی عنبریں فام
چلی ناگمت اپنا کرنے سنگار	کہ جس کا ناگمت مشہور تھا نام
نہا کر گھنے بال پھیلا دیئے	سنگار اس نے کیا اپنا سراپا
جفاکار نے جال پھیلا دیئے	کہ جوں دستور ہوتا ہے لنسا کا
بہت سرخ ہاتھوں میں مہندی ملی	کناری اوڑھنی کی منہ پہ دلخواہ
لبوں پر دھواں دھار مستی ملی	نمایاں تھی برنگ ہالۂ ماہ
ستم اس پہ لاکھا جما کر کیا	لباس تاش میں رخشاں وہ دلبر
جفا پر جفا پان کھا کر کیا	شعاعی خط میں جوں خورشید انور

لگایا جو کاجل ستم ڈھا دیا
نظر پھیر کر سب کو تڑپا دیا
دوپٹے کو کچھ سر سے سرکا دیا
اک آنچل کو کندھے سے لٹکا دیا
کمر بال سی، سینہ نکلا ہوا
جوانی کے دن حسن اُبلا ہوا

تنخانۂ خلیل

اسی طرح بن ٹھن کے وہ گلبدن
نئے سر سے جو تھی کی بن کر دلھن
وہاں سے چلی آئی طوطے کے پاس
وہ تشریف لائی پرندے کے پاس
کہا اے زمانے کو چھیلے ہوئے
اکھاڑے میں پریوں کے کھیلے ہوئے
قسم ہے تجھے اپنے ایمان کی
رتن سین کے سر مری جان کی
سراندیپ کا حسن مشہور ہے
وہاں جو ہے وہ غیرت حور ہے
بتا واں بھی ایسی حسیں ہے کوئی
مری طرح بھی نازنیں ہے کوئی
بھلا مجھ سا کوئی حسیں ہوگا کیا
برابر مرے نازنیں ہوگا کیا

وہ ڈورا سرمہ کا چشم سیہ فام
رم آہو کا تھا اک حلقہ دام
غرض بن ٹھن کے وہ غارتگر دل
رُخ آئینے سے کرتی تھی مقابل
نظر آیا اُسے اپنا جو عالم
مصفا چہرۂ و ابروئے پرخم

شمع و پروانہ

نگہ کر کے دمی میں حسن تو ابیں
ہوئی عاشق وہ اپنی آپ خود بیں
اسی غمازی میں تیوری چڑھا کر
قفس طوطے کا ہاتھوں میں اٹھا کر
کیا آئینہ ساں اس کی طرف رو
کہا ہنس کر کہ اے مرغ سخن خو
نہایت تو پھرا ہوگا جہاں میں
رہا اکثر ہے بزم گلرخاں میں
پدم کا تونے ہیگا ناز دیکھا
ہے اس کے حسن کا انداز دیکھا
قسم دیتی ہوں تجکو مجھ سے سچ بول
ٹک اپنے دیدۂ انصاف کو کھول
کہ میرا حسن بہتر یا پدم کا
بتا دے فرق جو ہو بیش و کم کا

طوطے کا جواب جائسی کے الفاظ میں:

"توتا پدماوت کا حسن یاد کر کے ہنسا۔ ناگمت رانی کا منہ دیکھا اور کہا جس تالاب میں ہنس نہیں وہاں بگلا ہنس کہلاتا ہے۔ خدا نے زمانے میں ایسے ایسے خوبرو پیدا کیے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر حسن میں ہے سنگلدیپ کی عورتوں کا کیا حال پوچھتی ہو۔ وہاں تو تمہاری جیسی عورتیں پانی بھرتی ہیں۔"

اس بیان کو خلیل نے اپنے انداز بیان سے کتنا دلچسپ بنایا ہے۔ عبرت کے بیان کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

بتخانۂ خلیل

نہ ضبط اس سے یہ بات سن کر ہوا
یہ کہنا گراں اس کے دل پر ہوا
کہا اس نے یہ ناز اچھا نہیں
تکبر حسینوں کو زیبا نہیں
حسینوں سے خالی یہ خلقت نہیں
کسی بت کو سب پر فضیلت نہیں
سراندیپ میں وہ جو گلفام ہے
پری زاد ہے پدمنی نام ہے
بنایا ہے خالق نے ایسا اسے
کہ زاہد بھی کرتے ہیں سجدہ اسے
یہ کہتے ہیں جتنے ہیں اس دیس میں
پری ہے یہ انسان کے بھیس میں
جو تم اس کو دیکھو تو دل تھام لو
نہ پھر عمر بھر حسن کا نام لو

شمع و پروانہ

ہوئی جب پھر کے رانی یاد پیا
اٹھا توتے کے سر میں اک دھواں سا
کہا رانی سے سن اے ناز پرور
رہے نت چتر دولت تیرے سر پر
پدم کی بات سچ مت پوچھ مجھ سے
کہ ہے وہ گل نہایت دور تجھ سے
اگرچہ تو بھی اک رشک پری ہے
ترے ہر عضو میں جادوگری ہے
ولیکن اس پری رو کا کف پا
ترے منہ سے کہیں دلچسپ ہوگا
جو دیکھے شکل تو اس دلربا کی
نظر آئے تجھے قدرت خدا کی
نکل آئے جو خورشید جہانتاب
فروغ رخ اڑے مانند مہتاب

خلیل کا لہجہ کتنا تیکھا اور طنز بھرا ہے۔ ضرورت بھی اسی کی تھی کیوں کہ لہجہ کی اس تلخی نے ناگمت کو جھنجھوڑ کر رکھدیا اور پھر اس نے اس ڈر سے کہ کسی دن وہ راجہ کے سامنے پدمنی کا ذکر نہ کر بیٹھے توتے کو جان سے مار ڈالنے کا حکم دیا۔

پدماوت کے حسن کی تعریف توتے کی زبانی:

ناگمت اور توتے کے نوک جھونک کی خبر رتن سین کو ہوتی ہے تو حقیقت جاننے کے لیے توتے کو تنہائی میں بلا کر اس سے تفصیل سننا چاہتا ہے۔ توتا اس خیال سے کہ کہیں راجا پدمنی کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے اُسے عشق کے جنون سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر خلیل کا زور بیان قابل مطالعہ ہے:

لگا کہنے اے تاجدارِ جہاں — وحید جہاں، شہریارِ جہاں
پیالہ نہ پی زہر کا جان کر — نہ قصہ کہانی یہ تو کان کر
سنبھل دیکھ کیا قہر کرتا ہے تو — یہ کیوں پاؤں دلدل میں دھرتا ہے تو
کڑی ہے محبت کی منزل بہت — وہاں تک پہنچنا ہے مشکل بہت
کہا مان، اس میں ہے ڈر جان کا — خطر جان کا ہے ضرر جان کا
نہ لے نام عشقِ ستمگار کا — نہ کر ذکر تو اس جفا کار کا
جگر میں یہ ہوتا ہے نالا کبھی — کلیجے کا بنتا ہے چھالا کبھی
گلے کا یہ خنجر کبھی بن گیا — رگ جاں کا نشتر کبھی بن گیا
کبھی زخم دل کا نمکداں ہوا — جگر میں کبھی نوک پیکاں ہوا
نظر جس پہ کی جی سے کھویا اُسے — دیا جس کو پانی ڈبویا اُسے
قیامت کی اس بحر کی لہر ہے — جو قطرہ ہے وہ سانپ کا زہر ہے
نہ مانے گا کہنا تو پچھتائے گا — بچے گا نہ بے موت مر جائے گا

توتے کی اس تقریر کا جب کوئی اثر نہیں ہوتا اور رتن سین کا اصرار زیادہ

ہوتا ہے تو تو نا پدماوت کے سنگار اور اس کے حسن کی تصویر کھینچتا ہے۔ جائسی نے جو معنی آفرینی کی ہے اس کا اندازہ ان کے اشعار کے اس خلاصہ سے ہوتا ہے

" اس کے سنگار کا کیا بیان کروں۔ اس کا سنگار اسی کو سزاوار ہے۔ پہلے اس کے موئے مشکیں کا حال سن کر پیچ و خم اس کے لہریا لیتے ہوئے سانپ ہیں۔ جب چوٹی کھول کر وہ بال جھاڑتی ہے تو آسمان سے تحت الثریٰ تک اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ابھی اس کی مانگ میں سیندور چڑھا نہیں۔ وہ بغیر سیندور کے ایسی ہیں گویا اندھیری رات میں راہ روشن ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر آفتاب کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ سورج کو طلوع ہوتے دیکھ کر چاند جیسے دھوپ میں منہ چھپا لیتا ہے آسمان پر جو دھنک نکلتی ہے اس کی بھویں دیکھ کر شرما جاتی ہے۔ پلکیں ایسے تیر ہیں جن کا کشتہ سارا سنسار ہے۔ اس کی ناک سے لٹکتی ہوئی بلاق گویا زہرہ نے طلوع کیا ہے لب آب حیات سے بھرے ہیں۔ باتیں امرت جیسی جن سے پھول جھڑتے ہیں۔ انھیں کسی نے چھوا نہ کسی نے دیکھا۔ تمام زمانہ اس کے لبوں کی اُمید رکھتا ہے۔ معلوم نہیں یہ گلِ شگفتہ کس کی تقدیر کا ہے۔ جب ہنستی ہے تو دانت ایسے چمکتے ہیں جیسے پتھر میں شرارے۔ ان کی چمک روشنی بن کر آنکھ سے دل میں اترتی ہے۔ رخسار کے بائیں طرف ایک تِل ہے۔ جس نے وہ تِل دیکھا دمبدم جلنے لگا۔ کان میں سونے کی بالیاں دونوں طرف بجلیاں چمکاتی ہیں۔ سنگلدیپ کے دیوتا اس خوف میں رہتے ہیں کہ ان پر کہیں یہ بجلیاں نہ گر جائیں۔ چھاتیاں مثل

لیموں کے اُبھار پر ہیں۔ یہ انار اور انگور کسی کی دسترس میں نہیں۔ بہت سے راجہ مر گئے جوگ سادھ کے۔ کسی میں دم ان کے چھونے کا نہیں ہوا۔ ہاتھ مل کر چلے گئے۔ بدن کی خوشبو ایسی جیسے تازہ کھلا ہوا کنول۔ نازک ایسی کہ پھول چھونے سے بیقرار ہو جائے پھول کی پتیاں یعنی پنکھڑیاں پھولوں سے نکال کر بچھائی جاتی ہیں پلنگ پر کہ بدن میں نہ چبھیں"۔

بتخانۂ خلیل

عجب حُسن پایا ہے اس ماہ نے
بنایا ہے آپ اس کو اللہ نے
نظر آنکھ میں آرزو دل میں ہے
چمن میں ہے گل شمع محفل میں ہے
بڑی قد سے بھی اسکی لمبان ہے
وہ چھل بل ہے ناگن بھی قربان ہے
وہ مانگ اس کی ہے راہ ظلمات کی
جبیں چاندنی چودھویں رات کی
وہ نوخیز جوبن کا عالم غضب
کمر ہی کے حصّے میں آیا ہے لوچ
رگِ گل سے بھی بڑھکے پایا ہے لوچ
ملائم ہیں دست حنائی بہت
نزاکت لئے ہے کلائی بہت
نہ دہرا نہ ایسا اکہرا بدن
نہایت ہی موزوں چھریرا بدن

اُبھار ان کا سینے پہ [illegible] غضب

شمع و پروانہ

ٹھہرتا ہی نہیں نظارہ اس پر
کوئی سورج کو دیکھے کیا برابر
کہوں کیسا ہے اس کا قد و قامت
بلا و فتنہ و آفت قیامت
جو کوئی دیکھے وہ سوئے سیہ فام
بلا ٹوٹے وہیں اس پر سر شام
نمایاں مانگ ہے یوں اسکے سر پر
فلک پر جیسے کھینچا ہو خط زر
سحر کا جسطرح نکلے ہے تارا
کنارے چشم کے اک خال ہے گا
کہ جیسے بچۂ آہو ہو الجھا
دہن میں اسکے ہے وقت تکلم
برنگ غنچہ اک رنگیں تبسم
جو دیکھا حسن اس سینے کا رخشاں
ہوا آب بقا ظلمت میں پنہاں

پسینے کی خوشبو سوا عطر سے | وہ انگیا ہے نگرا بر بہاری
بدن سر سے پا تک بسا عطر سے | کرنت چمکے ہے واں برق وکٹاری
سرور جگر راحت دل ہے وہ | کھول کیا حلقہ اس نازک کمر کا
کلیجے میں رکھنے کے قابل ہے وہ | کہ چشم حور کے سرمے کا ڈورا
وہ گلپوش ہے اٹھی کونپل ابھی | کھول کیا جلد کی اس کی صفائی
ہے کچا ہی وہ ناز کا پھل ابھی | کہ جیسے دودھ پر ہلکی ملائی
ابھی اتری منت کی ہنسلی نہیں | اگر پہنے وہ جوڑا ارغوانی
ابھی پوری چودہ برس کی نہیں | ہو شادی مرگ عالم ناگہانی
نہیں وہ بنی ہے دلہن اب تلک | بدن پر اس کے زیور کو جلا ہے
اچھوتی ہے وہ گلبدن اب تلک | کہ جیسے آگ پر رکھا طلا ہے

دونوں ترجموں کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جائسی کے بیان کا ترجمہ تو کیا تشریح بھی ممکن نہ تھی۔ عبرت نے نبھانے کی کوشش کی ہے لیکن خلیل کا جو پیرایۂ بیان ہے وہ اتنا مؤثر ہے کہ رتن سین کے عشق کو پر پرواز دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ بالخصوص یہ اشعار:

سرورِ جگر، راحتِ دل ہے وہ
کلیجے میں رکھنے کے قابل ہے وہ
ابھی اتری منت کی ہنسلی نہیں
ابھی پوری چودہ برس کی نہیں
نہیں وہ بنی ہے دلہن اب تلک
اچھوتی ہے وہ گلبدن اب تلک
نظر آنکھ میں، آرزو دل میں ہے
چمن میں ہے گل، شمع محفل میں ہے

ناگمتی سے رتن سین کی جدائی :

توتے سے پدماوت کے حسن کی تعریف سن کر رتن سین کا دل ایسی عشق کی چوٹ کھاتا ہے کہ اس کو پانے کے لیے راج پاٹ چھوڑ جوگی بنتا ہے اور ناگمتی کو اپنے پیچھے تڑپتا چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ جائسی نے اپنی پدماوت میں اس موقع پر بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ ناگمتی کی زبان سے صرف اتنا کہلایا ہے ۔

"رانی ناگمتی رو کے کہنے لگی۔ اے شوہر! کس نے تجھکو جنگل کی راہ دکھائی اب کون یہاں آسائش دے گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ جوگن ہو جاؤں گی۔ یا تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا مجھے مار کے جاؤ۔ سیتا بھی تو رام کے ہمراہ تھی۔ میں تمہاری خدمت کروں گی۔ پاؤں دابوں گی۔ جس پدمنی کے واسطے تم جوگ لے رہے ہو کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ حسین ہوگی"۔

خلیل حسن نے جائسی کے مکالمۂ ناگمتی کی جگہ رتن سین سے اس کی جدائی یعنی بچھڑنے کی کیفیت کو منظوم کیا ہے۔ عبرت نے عام مثنویوں کی طرح حالت فراق کی ترجمانی کی ہے۔

منتخبانۂ خلیل	شمع و پروانہ
رتن سین جوگی ہوا جس گھڑی	دلے رانی کا اس کی کیا کہوں حال
ہوا ناگمتی سے جدا جس گھڑی	کہ اس کا تھا یہاں تنگ تنگ احوال
تو اس غم کی ماری کا جی رک گیا	جگر تھامے ہوئے غمگین و بیتاب
جگر آتش عشق سے پھنک گیا	پھرے تھی لوٹتی مانند سیماب
جو تھے پھول سے گال کو لے ہوئے	کبھی وحشت میں باہر کو نکلتی

وہ جوبن جگر کے پھپھولے ہوئے
اُٹھا کر خاک گاہے منہ پہ ملتی

جھڑی آنسوؤں کی ذبڑنے لگی
کبھی زانو پہ سر رکھ کر وہ ناچار

خفا آپ ہی پر وہ ہونے لگی
کسی جا بیٹھ رہتی شکل بیمار

ہوئی درد فرقت سے دلگیر وہ
کبھی بیتاب ہوکر در پہ آتی

سراپا ہوئی غم کی تصویر وہ
جگر تھامے ہوئے پھر لوٹ جاتی

بڑھا درد دل بجوش سودا، سوا
یہ گرمی اس کی آہوں سے تھی پیدا

غمِ ہجر قطرے سے دریا ہوا
کہے تو باغ سارا جل گیا تھا

لگی کھینچنے آہ وہ ناتواں
کیا نتھ کو رُخِ دلخواہ سے دُور

نکلنے لگا اس کے منہ سے دھواں
کیا بالے کو اپنے ماہ سے دُور

نہ ہاتھوں میں مہندی کی رنگت رہی
وہ زیور موتیوں کا سب اتارا

نہ پوروں میں چھلوں کی کثرت رہی
نچوڑا مہر نے کوئی ستارا

خلیق نے اپنے قلم کو یہیں نہیں روکا ہے بلکہ بیان کو جاری رکھتے جو اسلوب فراق کے بیان میں اختیار کیا ہے وہ سحرالبیان سے اتنا قریب ہے اور اتنی مماثلت رکھتا ہے کہ ان اشعار پر سحرالبیان کے اشعار کا گمان ہوتا ہے۔ انھیں اگر "سحرالبیان" کے اشعار میں خلط ملط کر دیا جائے جو میر حسن نے بے نظیر کی مفارقت میں بدر منیر کی زبان سے ادا کیے ہیں تو یہ پہچاننا دشوار ہو جائے کہ ان میں خلیل کی پدماوت کے اشعار کون سے ہیں اور سحرالبیان کے کون سے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لیے خلیل اور میر حسن دونوں کی مثنویوں کے اشعار درج کیے جاتے ہیں :

بتخانۂ خلیل	سحرالبیان
وہ جینا جدائی کا دوبھر ہوا	دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
گراں پیرہن اس کو تن پہ ہوا	درختوں پہ جا جا کے گرنے لگی

نہ پوشاک کی قدر و قیمت رہی
نہ زیور سے اسکو محبت رہی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلود خواب

الگ چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں
ادھر پھینکدیں کچھ اُدھر پھینکدیں

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے رونے لگی

نہ نازک کلائی میں کنگن رہے
نہ بازو پہ سونے کے جوشن رہے

وہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

نہ غم تھا جو چوٹی ہوا سے کھلی
جو چوٹی کھلی تو بلا سے کھلی

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے
محبت میں ذرات گھٹنا اُسے

سوا دن سے راتوں کو رونے لگی
سحر آنکھوں میں ہونے لگی

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو

مہینوں وہ کپڑے بدلتی نہ تھی
کبھی عطر بھولے سے ملتی نہ تھی

جو پانی پلانا تو پینا اُسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نہ کھانے کا اس کو نہ پینے کا ہوش
نہ مرنے کی پروا نہ جینے کا ہوش

نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر
نہ سر کی خبر نہ بدن کی خبر

شب و روز تھا دلکو رونا پسند
نہ کھانا پینا نہ سونا پسند

اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں
جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں

نہ وہ چاندنی اسکی صورت رہی
نہ اگلی سی چہرے کی رنگت رہی

نہ منظور سرمہ نہ کاجل اُسے کام
نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

اس میں شک نہیں کہ خلیل نے میر حسن کے اشعار سامنے رکھ کر لکھے ہیں لیکن جو کچھ کہا ہے اس میں ان کا اپنا بھی بہت کچھ ہے۔

اسی بیان فراق کو جاری رکھتے ہوئے خلیل نے اپنی فکر کو کچھ اور پرواز دیئے ہیں ہزار منت سماجت کے باوجود رتن سین کے نہ رکنے پر

ناگمت نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اور اپنا سارا غصّہ زیورات پر اتارا ہے ان میں گلزار نسیم کے ان اشعار کی گونج ہے جو گل بکاولی نے باغ سے پھول چرا لے جانے پر ادا کئے ہیں ۔

نسیم کی صورت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھول اور پودوں کے نام نہیں بلکہ بکاولی کی خواصوں کے نام ہیں اور خلیل کی صورت میں ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ زیورات کے نام نہیں ۔ خلیل نے اپنے انداز بیان سے ان کو جاندار بنا دیا ہے ۔

بتخانۂ خلیل

کرشموں نے کبھی کچھ نہ ٹوکا اُسے
نہ غمزوں نے بھی ہائے روکا اُسے
یہ پازیب تو پاؤں پڑتی ذرا
کمر کر دھنی تو پکڑتی ذرا
یہ منہ دیکھی آرسی کیوں رہی
یہ منہ باندھے چنپا کلی کیوں رہی
نہ چوڑی نے بھی ہاتھ پکڑا ذرا
نہ زنجیر نے پاؤں جکڑا ذرا
چل اب یاں سے جگنی سرک دور ہو
نہ سینے پہ میرے چمک دور ہو
گلا چھوڑ دے پچلڑی تو بھی اب
نہ رہ ناک میں نتھ پڑی تو بھی اب
مرے پاؤں سے تو بھی چھاگل نکل
گلے سے مرے تو بھی ہیکل نکل

گلزار نسیم

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا!
شمشاد کو سولی پر چڑھانا
او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

کلائی مری چھوڑ کنگن ذرا　　نکھرا تیں خواصیں صورت بید
سرک میرے بازو سے جوشن ذرا　　ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

پدماوت کی رتن سین کیلئے بیقراری :

توتا ہیرامن رتن سین کی رہبری کرتا ہوا اسے سراندیپ لاتا ہے۔ اسے مہا دیوجی کے مندر میں چھوڑ کر پدماوت کے پاس جاتا ہے اور رتن سین کا حال کہہ سناتا ہے۔ پدماوت پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے جائسی کے پاس اس کی تفصیل صرف اتنی ہے۔

"توتے نے پدماوت سے کہا کہ میرے منہ سے تمہاری تعریف سن کر راجہ کے دل میں عشق کی آگ لگ گئی۔ راج چھوڑ کر تمہارے لئے جوگی بن گیا ورنہ کہاں چتوڑ گڑھ اور کہاں سراندیپ۔ خدا جس کا جوڑا ملادے وہ کسی نہ کسی طرح اس سے مل جاتا ہے۔ ہیرامن سے جوگی راجہ کا حال سن کر اس کے دل میں بھی آگ لگ گئی۔ بولی۔ وہ آتش عشق میں جلا اور اس کی آگ کی چنگاری مجھ تک پہنچی۔"

خلیل نے اس پر اچھا رنگ چڑھایا ہے۔ توتا پدماوت سے کہتا ہے:

ترا نام لینا غضب ہو گیا　　وہ دل تھام کر جاں بلب ہو گیا
وہ اتنی بڑی سلطنت چھوڑ دیتی　　دیا چھوڑ گھر مملکت چھوڑ دی
وہ اچھا بھلا غم کا روگی بنا　　ترا نام لیکر وہ جوگی بنا

پدماوت اچانک ایسی خبر سن کر بیقرار ہو جاتی ہے۔ دل جل کر دھواں دینے لگتا ہے اس اضطراب کی کیفیت تبحانہ خلیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو۔

نغمانۂ خلیل

لگا جوشِ غم میں غش آنے اُسے
مگر کچھ سنبھالا حیا نے اُسے
نئی بات اُسے دل سمجھانے لگا
غم اٹھ اٹھ کے دل کو بٹھانے لگا
ہنسی نے لبوں سے کنارا کیا
تڑپ نے جگر پارہ پارا کیا
فلق نے گلے سے لگایا اُسے
سرشکِ الم نے بہایا اُسے
زمیں کی طرف پھٹ کے داماں چلا
نکل کر گلے سے گریباں چلا
گرانباری جانِ بسمل بڑھی
گھٹا زور بیتابیِ دل بڑھی
تمنائے دل جوش کھانے لگی
طبیعت کو وحشت ستانے لگی
نئی دل میں پیدا ہوئی آرزو
یہی دل سے کرنے لگی گفتگو
دکھاؤں کسے جا کے دل کی یہ چوٹ
لڑکپن کی پہلے پہل کی یہ چوٹ

شمع و پروانہ

جو توتے سے سُنی حیرت کی گفتار
ہوئی وہ نازنیں اک نقشِ دیوار
محبت نے بچھایا دام کاکل
پری کا طائر آسا پھنس گیا دل
جوانی کا تھا وہ عالم پدم کا
سرایت کر گیا قصہ یہ غم کا
کیا غم نے جو ابرو کا اشارا
خوشی نے کر لیا اس سے کنارا
غبار آہ نے سینے کے اندر
کیا آئینہ آسا دل مکدر
لگا کر شعلۂ عشق فتنہ گر نے
لگا جوں شعلہ غارت اسکو کرنے
وہ جانا عشق تھا غالب رتن کا
لیا دل کھینچ دم میں سیم تن کا
صنم کا ہووے ہر چند آہنی دل
دلِ عاشق اگر ہے جذب کامل
وہ آہن کو ہے بالتخصص کھینچے
برنگِ سنگ مقناطیس کھینچے

شمع و پروانہ کے اشعار کی جو بے کیفی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں سے مثنوی عشرت کے ہاتھ میں آتی ہے جو عبرت کے مقابلہ میں کم صلاحیت کے شاعر ہیں۔ اور روا روی میں مثنوی کی تکمیل کی ہے۔ واقعہ کو نظم کر دیا ہے۔ شعریت

نام کو نہیں۔ اس کے برعکس خلیل کے اشعار کی تڑپ محسوس کیجا سکتی ہے۔ ایک دوشیزہ کے جذبات کی صحیح عکاسی کے لیے یہ ایک شعر ہی بہت کافی ہے۔

دکھاؤں کسے جا کے دل کی یہ چوٹ
لڑکپن کی پہلے پہل کی یہ چوٹ

رتن سین کا خط پدماوت کے نام:

عشقیہ مثنویوں کی روایت میں نامہ و پیغام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے سماجی پابندیوں کے سبب اظہار عشق زیادہ تر نامہ و پیغام کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثنوی نگاروں نے اس میں بڑی بڑی کاوشیں کی ہیں۔ خلیل نے اس روایت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

رتن سین سراندیپ پہنچ کر مہادیوجی کے شوالے میں فراق کے دن کاٹتا ہے اور توتے جیسے نامہ بر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی نادیدہ محبوبہ پدماوت کو پہلا محبت نامہ لکھتا ہے۔ جائسی نے خط لکھنے کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اس کا متن نہ لکھ کر توتے سے کہتا ہے کہ خط دینے سے پہلے میرا پیغام زبانی سنانا۔

"رتن سین نے پدماوت کی یاد میں اشک خونیں بہائے اور آنسو جو سرخ آنکھوں سے گرے تو اس خون سے خط لکھ کر توتے کو دیا اور زبانی توتے سے یہ بات کہی کہ پہلے میری طرف سے کلمات عجز و خلوص کہنا۔ پھر دوسری بات سنوار کر یہ کہنا کہ آنکھیں محتاج دیدار ہیں کسی طرح تسلی نہیں پاتیں۔ عشق کی بات کس سے بیان کروں جس سے کہوں وہ جل کر خاک ہو جائے۔ خط تمہارا نام لیکر لکھا تو لہو سے لکھے ہوئے حروف نے سب کچھ سیاہ کر ڈالا۔ اب یہ مقام مرجانے کا ہے کہ خالی

خط معشوق کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ ملاقات ہوتی تو سارا دکھ کہہ سُناتا ہے۔"

اس متن کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بتخانۂ خلیل کا خط خلیل کی جدت طبع ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خلیل نے رازی یا عشرت کی تقلید کی ہو کیونکہ یہ محبت نامہ شمع و پروانہ میں بھی ہے۔

بتخانۂ خلیل	شمع و پروانہ
یہ لکھا کہ اے نازنین جہاں	رگ مژگاں سے پہلے اک قلم کی
صبیح زمانہ، حسین جہاں	سواد چشم سے حالت رقم کی
غریب اک مسافر بہت دور کا	گل باغ حیا و سرو قامت
تمہارے ہی رجھٹ میں آکہ ٹکا	یہ گلزار جہاں رہبر سلامت
خبر اس کی لینا ہے تم کو ضرور	چراغ افروز بزم عاشق زار
اسے اپنا درشن ہے دینا ضرور	سحر میری ہے تجھ بن اے شب تار
اب آگے لکھوں کیا بیاں الم	یہ غفلت تا کجا کہہ او خود آرا
بہت طول ہے داستان الم	ادھر بھی اک نگہہ اے بت خدارا
تمہیں اپنی بانکی نظر کی قسم	کہوں میں بسکہ اے مہر درخشاں
تمہیں اپنی پتلی کمر کی قسم	سحر ہے بے ترے شام غریباں
قسم تم کو چشم فسوں ساز کی	کبھی بسمل پہ تو بہر تماشا
قسم ہے تمہیں ناز و انداز کی	خدا کے واسطے تشریف فرما
قسم تم کو ان لمبے بالوں کی ہے	مسیحائی کو لا اپنے قدم تو
تمہارے بغیر اب گزرتی نہیں	پریشاں بسکہ اے رشک چمن ہوں

۱؎ شیخ احمد علی۔ ہدایت بخط فارسی ص ۲۱۴، ۲۱۵

جو دن کٹ گیا شب گزرتی نہیں ۔۔۔ بسان گل دریدہ پیرہن ہوں
بس اب تم نہ انتظار لاؤ مجھے ۔۔۔ کہ میں ہوں چھوڑ اپنا راج آیا
مٹائے خدا یہ ملال فراق ۔۔۔ کبھی صورت کسی صورت دکھا دے
زیادہ لکھوں کیا بجز اشتیاق ۔۔۔ مریض غم کو اپنے اک شفا دے

پدماوت کا خط رتن سین کے نام :

توتا رتن سین کا خط لاکر پدماوت کے حوالے کرتا ہے اور زبانی پیام کہہ سناتا ہے۔ پدماوت خط کا جواب دیتی ہے۔ جائسی لکھتے ہیں :

"پدماوت قلم دوات طلب کر کے جواب خط لکھنے بیٹھی۔ آنسو جاری ہوئے سارا محرم بھیگ گیا۔ لکھا اے یوگی! کتنوں نے اس طرح مجھ پر جان گنوائی۔ میں رانی پدماوت ہوں۔ ساتویں آسمان پر میرا مقام ہے۔ اس کے ہاتھ لگوں گی جو اپنے آپ کو پہلے فنا کر دے۔ میں تمہارا خط آنے سے خوش ہوئی محبت آدھی ملاقات ہے[1]۔ اگر تو محبت کا نباہ چاہے تو بھونرے کو دیکھ کہ پھولوں کے کانٹوں سے الجھ جاتا ہے۔ پروانے کو دیکھ شمع پر کیسے جل مرتا ہے۔ جو سمندر میں ڈوب کر تہہ میں جائے وہی گوہر پاتا ہے۔ کنول ہو کر آفتاب کی امید رکھ۔ میں بھی تیری محبت میں

---

[1] ہوں پن اہوں اپس تمہ راتی
آدھی بھینٹ پریتم پاتی
(میں تمہارے خط آنے سے خوش ہوئی۔ خط محبوب کا آدھی ملاقات ہے)
شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی۔ کانپور ۱۸۷۶ء ص ۲۲۲

اسی طور ہوں ۔ ستارے راہو کو جب ارجن نے بیدھا تب دروپدی
سے بیاہ ہوا۔"

خلیل نے جائسی کے اس مضمون خط کو جو تصوف کے انداز میں ہے نظر انداز کر کے بالکل عاشقانہ انداز کا خط لکھا ہے۔ خط کے اشعار دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں یہ اسلوب کتنا فطری ہے کہ پدماوت جب جواب لکھنے بیٹھتی ہے تو اس کو کچھ سوجھتا نہیں۔ ایک اجنبی کو کیا جواب دے۔ کیا القاب لکھے۔ کن لفظوں میں مخاطب کرے۔ اظہار عشق کے جواب میں اقرار محبت کرتی ہے تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کشمکش اور جذباتی تناؤ کو پدماوت کس طرح کاغذ پر بکھیرتی ہے اس کا اندازہ خلیل کے اشعار سے کیجئے جذبات نگاری کی ایسی مثال بہت کم پڑھنے میں آتی ہے۔

تخانۂ خلیل

پڑی سوچ میں لکھوں القاب کیا
میں اسکے لیے ڈھونڈوں آداب کیا
لکھوں اسکو راجا کہ جوگی لکھوں
کہ الفت کا بیمار روگی لکھوں
جو لکھتی ہوں عاشق مناسب نہیں
جو مشتاق لکھتی ہوں واجب نہیں
دیا لکھ کے کاٹ اسکو اے مہرباں
کیا چاک خط لکھ کے اے قدرداں
لکھا آخر اے طالب بیقرار
مرے حسن نادیدہ کے خواستگار
جو خط تم نے لکھا وہ مجھکو ملا
کروں اپنے توتے کا میں کیا گلا

شمع و پروانہ

قلم لے کے ہاتھ میں وہ رشک تصویر
جواب اسکا لگی کرنے وہ تحریر
شہ فرمانروائے کشور عشق
رتن یعنی کہ زیب افسر عشق
کہ اے گلدستۂ باغ محبت
برنگ لالہ با داغ محبت
وہ تیرا نامہ اے سرو چراغاں
ہر اک جملہ تھا جسکا جوں گلستاں
نہاں ہر حرف میں تھے وہ معانی
کہ جوں ظلمت میں آب زندگانی
زبس وحشت فزا معنی رقم تھے
مگر مژگان آہو کے قلم تھے

بتخانۂ خلیل

یہ کیوں مجھ پہ تم شیفتہ ہو گئے
یہ نادیدہ کیوں مُبتلا ہو گئے
تمہیں کہنے سننے میں جانا نہ تھا
یہ بندے کی باتوں میں آنا نہ تھا
مری شکل و صورت تو اچھی نہیں
اجی جھوٹ ہے سچ یہ کچھ بھی نہیں
کچھ اچھا نہ یہ کام تم نے کیا
مجھے مُفت بدنام تم نے کیا
مرے واسطے جوگ لینا نہ تھا
مرے دل پہ یہ داغ دینا نہ تھا
مرا بھی اب احوال اچھا نہیں
مری زندگی کا بھروسا نہیں
زیادہ بیاں الم کیا لکھوں
شب و روز کا رنج و غم کیا لکھوں

شمع و پروانہ

جو حالت ہے تیری اے مہرِ تاباں
کہوں کیا میں کہ اس سے ہوں دو چند اِں
گدازِ غم سے تیری ہوں میں گلتی
ہے جیسے شمع ساری رات جلتی
اسیرِ الفتِ گل مثلِ بلبلِ گل
بدل خار و وصال حسرتِ گل
نہیں مقدور لیکن اس میں میرا
کہ دیکھوں آ کے میں دیدار تیرا
تو ہے اس جا یہ جیسے بلبلِ زار
یہاں میں مثلِ گل پہلو پرازِ خار
سراپا غم سے ہوں میں مثلِ تصویر
حیائے خلق پاؤں میں ہے زنجیر
کھنچی ہے ناتوانی بس یہاں تک
کہ نالہ آ نہیں سکتا زباں تک

شمع و پروانہ کا بیان بھی اگرچہ جائسی کے بیان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا لیکن ان کے نامہ میں پدماوت بھی کھل کر اقرارِ محبت کرتی ہے جو اس کے کردار کی صحیح ترجمانی نہیں۔ خلیل نے اس سے گریز کرتے ہوئے پدماوت سے جس محتاط انداز میں خط لکھوایا ہے وہ عین نسوانی فطرت کے مطابق ہے اور جائسی کے خیالات ہی کی ترجمانی کرتا ہے۔

پدماوت کا پوجا کے بہانے مندر کو آنا:

پدماوت نسبت کے دن اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے سہیلیوں کو ساتھ لیکر

باغ کی سیر کرتی ہوئی مہادیو کے مندر کو جاتی ہے۔ جائسی کے پاس یہ بیان یوں ہے

"پدماوت نے "تارا مندر" کا جوڑا زیب تن کیا۔ سر کی مانگ کو موتیوں سے سنوارا اور سہیلیوں کو لے کر باغ کی سیر کو گئی۔ چھتیس ۳۶ قوم کی عورتیں اس کے ہمراہ تھیں۔ خواصیں جو نیلوفر جیسی تھیں باغ میں اودھم مچایا۔ کسی نے آم کی ڈالی پکڑی۔ کوئی نارنگی توڑتی کوئی انار اور انگور۔ کسی نے چنپا کے پھول لیئے کسی نے گیندے کے۔ کسی کے ہاتھ میں ہار سنگار کے پھول تھے کسی کے پاس سیوتی۔ تمام دیوتا پدماوت کو دیکھنے لگے۔ یہ حسن و جمال تو سورگ کی اپسراؤں میں بھی نہیں۔ بالآخر پدماوت دیوتا کے دروازے پر پہنچی۔ مہادیو کی مورت کو سیندور لگا کر پدمنی نے پرارتھنا کی۔ سب خواصیں بیاہتا ہیں۔ میں ایک گنہگار کنواری ہوں۔ جس دن میری امید بر آئے گی سونے کا کلس چڑھاؤں گی۔ اب جواب کون دے۔ دیوتا تو مر گیا۔ پنڈتوں کی موت ہو گئی۔ جس نے پدماوت کو دیکھا مثل مار گزیدہ ہو گیا۔"

اس واقعہ کو منظوم کرتے میں خلیل نے جائسی کی باغ کی تفصیلات کو چھوڑ دیا ہے اور مندر کی طرف پدماوت کے خرام ناز کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ارباب ذوق ہی لذت یاب ہو سکتے ہیں:

بڑی ٹھاٹھ سے وہ دلہن بن چلی	خواصوں کو سب اپنے لیکر چلی
شوالے کے وہ حور جا کر قریب	اداؤں سے تشریف لا کر قریب
اتر کر خراماں خراماں چلی	لئے سیکڑوں دل میں ارماں چلی
چلی بڑھ کے شہر سو کو بکن	چلی شوق سے بل سے ملنے دلہن

زیارت کو دامن کے عذرا چلی — گلے ملنے مجنوں سے لیلےٰ چلی
چلی ہنستی بادِ سحر کی طرح — چلی اپنی تیغِ نظر کی طرح
وہ ناگن سی چوٹی لٹکتی ہوئی — وہ آنکھوں سے مستی ٹپکتی ہوئی
کہیں تو کڑے سے کڑے لڑ گئے — کہیں کھا کے ٹھوکر چھڑے لڑ گئے
کہیں بج کے گھنگھرو نے بیداد کی — کہیں لڑ کے چھاگل نے فریاد کی
وہ انداز پیارا وہ رفتار مست — نظر مست چشم فسوں کار مست
اِسی طرح پہنچی وہ مندر تلک — گئی اس شوالے کی قسمت چمک
غرض تھوڑی دیر اس نے پوجا کیا — جو مانی تھی کی اپنی منت ادا

خواصوں کا بناؤ سنگار :

خلیل حسن اور میر حسن دونوں نے اپنی اپنی ہیروئنوں کے علاوہ ان کی خواصوں اور سہیلیوں کے حسن اور بناؤ سنگار کا بڑا دلفریب نقشہ کھینچا ہے۔ سحر البیان کی تقلید میں تبخانۂ خلیل میں بھی اس پر بڑا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ خلیل نے اس اسلوب کو نبھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لئے دونوں مثنویوں کے اشعار درج کئے جاتے ہیں :

تبخانۂ خلیل

خواصیں کنیزیں طرحدار سب
شراب جوانی سے سرشار سب
کوئی گلبدن ماہ پارا کوئی
کوئی چاندرا میں ستارا کوئی
ہر انداز میں سیکڑوں ناز تھے !
ہر اک ناز میں لاکھوں انداز تھے

سحر البیان

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم
محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم
کنیزاں مہرو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
رنگیلی کوئی اور کوئی شام رنگ
کوئی چت لگن اور کوئی کام رو

مسی کی دھڑی سب جمائے ہوئے — کوئی کیکئی اور کوئی گلاب
دوالی سکا کاجل لگائے ہوئے — کوئی مہرتن اور کوئی مہتاب
سراپا ادا شوخ طناز سب — اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں
ستم گوش سرمایۂ ناز سب — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
کوئی ان میں نوخیز کوئی جواں — کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی
کوئی غارت جاں کوئی دلستاں — اری او رسیلی پکارے کوئی
شگفتہ تھا چہرہ اُبلتا تھا رنگ — بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
ٹپکتا تھا جوبن اچھلتا تھا رنگ — کہیں واہ وا اور کہیں وا جھڑے
قیامت بلا غارت ہوش سب — کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
گل اندام گلفام گلپوش سب — ادا سے کوئی بیٹھی کنگھی کرے
کوئی بانکی ترچھی رسیلی کوئی — نقابہ کوئی کھول مسی لگائے
نکیلی سجیلی رنگیلی کوئی — لبوں پر دھڑی اپنی کوئی جمائے

سُہاگ رات :

امیر احمد علوی لکھتے ہیں کہ مواصلت میں عریاں نگاری کی رسم قبیح میر اثر، میر حسن، مومن اور نسیم نے رائج کی تھی۔ قلق نے تو اپنی مثنوی طلسم الفت میں اپنا سارا کوک شاستر نظم کر دیا اور سنجیدہ صحبتوں میں اس مثنوی کے نام پر ثقات کی نگاہیں نیچی ہونے لگیں[1] میر اثر کی خواب و خیال پر ایک اور تنقید میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

---

[1] امیر احمد علوی۔ اردو کی مثنویاں۔ نگار اصناف نمبر، ۱۹۶ء ص ۱۲۹

"اردو کی طویل مثنوی میر اثر کی خواب و خیال میں عشقیہ واردات کا بیان اس قدر واضح اور کھل کر نظم کیا گیا ہے کہ اس کو اردو کی شرمناک اور خالص شہوانی مثنوی کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے[1]"

یہ رسم اتنی عام ہوئی کہ کم و بیش اکثر مثنویاں حدود سے تجاوز کر گئیں۔ جائسی کی پدماوت بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ انھوں نے جہاں اس بیان میں بڑی شاعرانہ خوبیوں سے کام لیا ہے وہاں استعارات کے پردے میں بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ خلیل نے اپنا انداز اختیار کیا ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے بہتر ہے کہ پہلے جائسی کے اشعار کا متن درج کر دیں:

"پتی اور پتنی کے گلے میں باہیں ڈالیں اور پتنی مجور شوہر کے گلے سے لگ گئی۔ پس دونوں باہم ہمکنار ہوئے گویا سونا اور سہاگا یکجا ہوئے رتن، پدماوت کے جسم پر مثل بھونرا او ہدف مراد پر تیر لگا تماشا اور کھیل کرتے رات گزری گویا جوڑا سارس کا باہم کلیلیں کرتا تھا۔ شوہر نے اپنے بازوؤں میں کس لیا پھر تو خوب آسودہ ہو کر آپس میں لہو ولعب کرنے لگے۔ ہونٹوں کا جتنا رس تھا بھونرے نے لے لیا۔ جو سامان و اسباب ہجر کا تھا وصل کے سپاہ نے لوٹ لیا۔ راجہ ہر طرح فتح یاب ہوا۔ جوش کھا کے ایسے ملے کہ دونوں ایک ہو گئے۔ باہنوں میں ایسا کھینچا سونے کو جیسے کسوٹی پر کستا ہے۔ غلبہ کیا شوہر نے عاجزی سے۔ پدماوت بھی ایسی خوش نصیب تھی خوشی میں آ کر صندل کی طرح شوہر کے گلے سے آ لگی۔ گیندے نے گویا گلاب

---

[1] حبیب احمد صدیقی۔ اردو کی ایک شرمناک مثنوی۔ نگار ۱۹۴۲ء

کو کنار میں لیا۔ انار نے انگور سے مزہ حاصل کیا اور بیداوت
بھی رضامندی سے شوہر میں تن من سے کھو گئی۔ صدف میں موتی
گرا اور دل مسرت میں ڈوب گئے۔
سجا ہوا سنگار سب لٹ گیا۔ فیل مست جوانی نے مستی دور کر دی
بدن کے کپڑے سب بدرنگ ہو گئے۔ گندھے ہوئے بال سب
کھل گئے۔ مانگ پریشان ہو گئی۔ محرم ریزہ ریزہ ہو گئی اور
بند ٹوٹ گئے۔ ہار کھل گیا موتی بکھر گئے۔ باز و بند اور کنگن جو
کلائی میں تھے پھوٹ گئے۔ صندل جو بدن میں تھا وقت ہم آغوشی
چھوٹ گیا۔ پیار سے پیارے کہتے ہوئے ناری کی زبان خشک
ہو گئی۔ محبوب کی لذت میں نازنین نے جان کی پروا نہ کی۔ گویا
موسم بہار میں ناشگفتہ غنچہ شگفتہ ہو گیا۔"
جائسی کے اس فن کو نگاہ میں نہ رکھتے ہوئے خلیل نے اپنا جو محاکاتی ڈھنگ
اختیار کیا ہے وہ بڑا نیچرل ہے اور نسوانی جذبات کا ترجمان ہے۔

بتخانۂ خلیل	شمع و پروانہ
وہ کچھ دیر خاموش پہلے رہے	بصد ناز و ادا مسند سے اُٹھ کے
رکے اور چپ دونوں بیٹھے رہے	چھپر کھٹ میں گئی آرام لینے
اِدھر صبر منہ اس سے پھیرے ہوئے	گرا دیں حیا نے چلمنیں چھپ بیٹھی خوش اسلوب
اُدھر شرم اس بت کو گھیرے ہوئے	کہ بیٹھے جا کے پس پردہ بہت خوب
اِدھر کچھ کچھ اس کا کھسکنا غضب	کہوں کیا اس گھڑی کا تم سے عالم
اُدھر وہ سمٹنا، جھجھکنا غضب	کیا کیا گیا مزے دونوں نے باہم
تقاضا اِدھر دل کا گھونگھٹ اُلٹ	بہم دونوں وہ مصروف طرب تھے
نہ اب اس میں کر دیر جھٹ پٹ اُلٹ	کہ بس سینہ بہ سینہ لب بہ لب تھے

بتخانۂ خلیل

ادھر اس پہ تاکید ہٹنا نہ تو
خبردار گھونگھٹ اُلٹنا نہ تو
نہ ہونٹوں سے باتو نکلنا ذرا
حیا تو یہاں سے نہ ٹلنا ذرا
ہنسی اس گھڑی تو نہ آنا کہیں
مرے ہونٹ تم کھل نہ جانا کہیں
ادھر کہہ رہی تھی وہ گلفام یہ
ادھر بڑھ کے اسنے کیا کام یہ
کہ چہرے سے گھونگھٹ اُلٹ ہی دیا
اُسے جلد اس نے پلٹ ہی دیا
اُڑا ہوش اب اس پریزاد کا
کہ موقع تھا غل کا نہ فریاد کا
لگی کہنے تم کو ہوا ہے یہ کیا
ارے خیر تو ہے یہ کیا ہے یہ کیا
سنو تو وہ مجکو بلاتی ہے کون
یہ چوڑی بجی کسکی آتی ہے کون
ارے در سے کھٹی تو لگی ہے کوئی
ہٹو جلد وہ دیکھتی ہے کوئی
غرض شب وہ یوں ہی بسر ہو گئی
وہ سونے نہ پائے سحر ہو گئی

شمع و پروانہ

کہوں کیا یکایک وہ مثل بلبل
بہم چنتے تھے عیش وصل کے گل
بزانو مستعد ہو کر وہ مائل
کر اپنے ہاتھ اس مہ کے حمائل
بنا طوق کمر وہ ساق سیمیں!
ہوا بس سلسلہ جنباں خوش آئیں
ہوا پرجوش جب ابر گہربار
کئے زیب صدف پھر در شہوار
غرض ہو باغ باغ اور شاد و خرم
بھرے اس غنچہ میں قطرات شبنم
بیاں کیا کیجے اس دم حال کیا تھا
بہم دونوں میں صد ناز و ادا تھا
کسی کا رنگ جوں مہتاب فق تھا
کسی کا رنگ رو مہر شفق تھا
کسی کے بند جامے کے گئے ٹوٹ
کسی کے موتی سراپا گئے چھوٹ
ملا دل دل سے تن سے تن ملا تھا
تھی لیل القدر یا دن عید کا تھا
برآیا اب کہ ان کا کوکب وصل
کہ بعد روز ہجراں تھی شب وصل

عشرت کے اشعار کے مقابلہ میں خلیل کے اشعار میں بے ساختگی اور شدت

جذبات کے ساتھ جو ٹھہراؤ اور اعتدال پسندی ہے اس کا نچوڑ ان کا یہ آخری شعر ہے کہ

غرض شب وہ یوں ہی بسر ہو گئی
وہ سونے نہ پائے سحر ہو گئی

میر حسن کے پاس بھی کھل کھیلنے کی بات بہت شوخ ہو گئی ہے۔

سہاگ رات کے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے جائسی نے صبح وشب وصال کی جو تصویر پیش کی ہے اس کی تقلید خلیل و عشرت نے بھی کی ہے۔ اردو کی دوسری مثنویوں میں اس انار کی کیفیت کا عالم نہیں ملتا۔ جائسی نے اپنی جدت طبع سے اپنے اس بیان میں بڑی شاعرانہ لطافتوں سے کام لیا ہے پہلے اس سے لطف اندوز ہو لیجئے:

"صبح ہوئی آفتاب طلوع ہوا۔ شوہر باہر آیا۔ سہلیاں پدماوت کے گرد جمع ہو گئیں۔ مذاق کرنے لگیں۔ اے پدماوتی –! تیری انگیا کے پان چونا ہو گئے ہار اور چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔ اے رنگ رنگیلی! تیرا رنگ کہاں گیا اے رانی تم ایسی نازک ہو کہ پھولوں کی خوشبو تمہاری غذا ہے۔ ایسی نازک کہ تمہارا سینہ متحمل ہار کا نہ ہو تم نے شوہر کا بوجھ کس طرح اُٹھایا۔ تمہارے ہونٹ، جو مثل کنول کے نازک تھے شوہر کے بوسے کو کیسے گوارا کر لیا۔ تمہاری کمر جو قدم دھرنے کے ساتھ مڑ جاتی ہے بل کھا جاتی ہے شوہر کے وصل میں کس طرح چین سے رہی۔ جتنا پاکیزہ تمہارا رنگ تھا سب میلا ہو گیا۔

پدماوت نے کہا اے سہیلیو! سچ حال تو یہ ہے کہ میں

جو پہلے کہتی تھی کہ عورت متحمل مرد کی نہیں ہوسکتی ہے جب بھونرے
کو پھول پر دیکھتی تھی کانپتی تھی اور جیسے چاند کو گہن لگتا ہے وہی
میرا حال تھا۔ خوف جب تک تھا شوہر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی
سورج کی نظر پڑتے ہی سردی جاتی رہی۔ اے سہیلیو! میں بھی
بہت ہوشیار تھی جتنی لہریں سمندر میں ہوتی ہیں سب سے مجھے
اطلاع تھی لیکن میری ساری ہوشیاری شوہر کی مدارات سے
جاتی رہی۔ ایک بھی داؤ میرا نہ چلا جو کچھ مجھ میں حسن اور جوبن تھا
سب میں نے ازراہ اخلاص نذر کئے۔ میرا سب کچھ اس میں جا ملا۔"
جائسی نے جس حسن سے اور جس بے باکی سے عورت کے جذبات کو زبان دی
ہے وہ ہندی شاعری کی دین ہے۔ اردو میں ایسی مثالیں مفقود ہیں۔ البتہ فراق نے
ایک شعر میں یہ ساری کیفیت سمودی ہے۔

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

خلیل کے یہاں حسن کی اس پامالی اور بے ترتیبی کا منظر کچھ اور ہی ہے اور بڑا
رومانی ہے۔ عشرت نے بھی اسے نبھانے کی کوشش کی ہے۔

بتخانۂ خلیل	شمع و پروانہ
سحر دم ہی پہنچیں خواصیں وہاں	پدم کے پاس آئیں محرم راز!
ہوئیں جمع سب اسکی ہمجولیاں	شریر و شوخ و دلبر اور ممتاز
تو دیکھا سنگار اس کا لوٹا ہوا	یہ دیکھا رنگ اس آراستہ کا
پڑا ہے الگ ہار ٹوٹا ہوا	گل باغ حیا نوخواستہ کا
وہ رنگ اسکے نعلیں لبوں کا نہیں	عجب ہی شکل اسکی ہو گئی ہے
وہ مسی نہیں ہے وہ لاکھا نہیں	کہ رنگ سرخ تن اب [illegible] ہے

بتخانۂ خلیل

پریشان کھل کر گندھے بال ہیں
وہ کافر بچھائے ہوئے جال ہیں
دوپٹا ہے سینے سے کھسکا ہوا
مسہری سے باہر ہے نکلا ہوا
لگیں چھیڑنے پدمنی کو وہ سب
کہ ہے حال یہ کچھ تمہارا عجب
یہ چولی ہے مسکی ہوئی کس لئے
یہ پوشاک ہے ملگجی کس لئے
پڑے ہیں یہ گالوں پہ کیسے نشاں
یہ کاہے کے ہیں نیلے نیلے نشاں
یہ ماتھے کی افشاں گئی چھوٹ کیوں
گئیں چوڑیاں ہاتھ کی ٹوٹ کیوں
پریشان ہے زلفِ خمدار کیوں
گیا ٹوٹ یہ نولکھا ہار کیوں
بتائیں تو سرکار ہے بات کیا
یہ کیوں ست گیا منہ ہوا رات کیا
یونہیں دیر تک وہ ستاتی رہیں
اسی طرح ہنستی ہنساتی رہیں

شمع و پروانہ

جو ملبوس عروسی زیب تن ہے
سو لیکر سر سے پا تک پُر شکن ہے
کہیں مسکی ہے انگیا بند ہیں باز
کسی جا سے گئی چل چین پشواز
جو لوٹے موتیوں کے ہار تھے سب
پڑے ہیں گرد مہ کے جیسے کوکب
جبیں پر تھی جو افشاں وہ نمایاں
سو ہیگا روئے فرش اب اس سے افشاں
بیاں کیا کیجے اس کے موئے کاکل
پریشاں ہیں سراسر مثلِ سنبل
ہوئے بوسے سے وہ اسکے لب و گال
برنگِ غنچہ، و مانند گل لال
مگر در بر اسے کھینچا ہے بس تنگ
کہ تن سے اسکے بستر پہ چوا رنگ
غرض تھی نازنیں یوں سر سے تا پا
کہ شب باشی میں گل جاتا ہے مرجھا
تھی سرگرمِ شرارت ہر پری رو
و لیکن وہ شرم سے تھی سر بزانو

متذکرہ بالا اشعار اور جائسی کے [illegible] پیش نظر رکھا جائے تو جائسی کے فکر کے تعمق اور خلیل کے حسنِ [illegible] بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناگمت کا خط رتن سین کے نام:

عموماً مثنویوں میں خفیہ ملاقاتوں کے ساتھ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان نامہ و پیغام کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے لیکن جائسی کی پدماوت میں یہ صورت حال مختلف ہے۔ یہاں دو ہیروئنیں ہیں۔ رتن سین اپنی پہلی رانی ناگمت کو چتوڑ میں چھوڑ کر پدمنی کی تلاش میں سراندیپ جاتا ہے اور بالآخر اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اس عرصہ میں وہ ناگمت کی خبر بھی نہیں لیتا۔ ناگمت کے لیے جُدائی جب ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پرندے کے ذریعہ اپنے شوہر رتن سین کو پیام بھیجتی ہے۔ جائسی کے الفاظ میں وہ پیام یوں ہے:

"اے پرندے! ان سے کہنا ـــ تمہارے بغیر ایک ایک پل مجھے ایک ایک برس لگتا ہے اور ایک ایک برس ایک ایک یُگ معلوم ہوتا ہے۔ ہر شام راستے پر نظر جمائے رہتی ہوں شاید تم آتے ہو۔ میں تمہاری آگ میں ایسی جلتی ہوں جیسے دھوپ میں پر بت۔ تم آکر اس آگ کو میرے حق میں گلزار کر دو۔ بچھونا پتی بن ناگ ہو کر ڈستا ہے۔ بدن کا گوشت خشک ہو گیا ہے۔ جی میں آتا ہے اپنا تن جلا کر خاک کر دوں۔

اور اے پرندے! پدماوت سے کہنا جس نے میرے شوہر کو فریفتہ کر رکھا ہے۔ اے شوہر چھیننے والی۔ تو گھر والی بن کے بیٹھی ہے اور میں سونی پڑی ہوں۔ تیرے بدن کو تو آرام ملے اور میرے تن من کو پیڑا۔ میں بھی بیاہی گئی ہوں تیرے شوہر کے ساتھ۔ اس پر میرا ادھیکار بھی ہے۔ اب مہربانی کر کے میرا شوہر مجھے لوٹا دے۔" مجھے عیش و عشرت سے کام نہیں۔ نقطہ دیا گیا

ہوں تو میری سوت نہیں۔ میری دشمن ہے۔ میرا شوہر تیرے ہاتھ میں ہے۔ ایک بار جس طرح بھی ہو مجھ سے ملا دے۔"

خلیل نے اس پیام کو بھی مثنوی کی تزئین کے لیے خط میں تبدیل کر دیا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے اس سے جائسی کے پیام کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ نامہ انھوں نے اپنے تخیل کے مطابق منظوم کیا ہے اور ناگمت کے جذبات مفارقت کی ترجمانی بڑے دلگداز انداز میں کی ہے۔

لکھا بے وفائے زمانہ اسے — لکھا عاشق غائبانہ اسے
شہ کشور بے وفائی لکھا — دُر بحر نا آشنائی لکھا
کہاں چھا رہا بیوفا جا کے تو — کدھر رم رہا مجکو تڑپا کے تو
تجھے فکر کچھ ناگمت کی بھی ہے — خبر اس کی کچھ کیفیت کی بھی ہے
تری ناگمت تو جہاں سے چلی — ترے گھر سے تیرے مکاں سے چلی
چلی روٹھ کر زندگانی سے وہ — چلی پھیر کر منہ جوانی سے وہ
مجھے تو نہ دُنیا کی لذت ملی — کبھی روز دل کو نہ راحت ملی
اکیلی بھری انجمن میں رہی — پریشاں ہمیشہ چمن میں رہی
پھرا مجھ سے تو کیا جہاں پھر گیا — زمیں پھر گئی آسماں پھر گیا!
بتا تو ہی یہ غم سہوں کس طرح — مکاں میں اکیلی رہوں کس طرح
نہیں سوجھتا کچھ کدھر جاؤں میں — یہ جی میں ہے کچھ کھا کے مرجاؤں میں
وہ صدیوں کی ماری خوشی کیا کرے — وہ مغموم خوش اپنا جی کیا کرے
کہ جب گھر میں گھر کا اُجالا نہ ہو — لگا کر گلے سونے والا نہ ہو!
کٹے ہائے برسات تو کس طرح — کٹے چاندنی رات تو کس طرح
کٹیں کس طرح زندگانی کے دن — جوانی کی راتیں جوانی کے دن
دلہن بن کے کنواری کی کنواری رہی — نہ دو روز بھی ہمکناری رہی

گئی رات بادل پہ نہ آئی بہار — سراندیپ میں جا کے چھائی بہار
ہر اک سمت بادل برستا رہا — مگر کھیت میرا ترستا رہا !!
لبوں پر ہے دم شوقِ دیدار میں — پڑی ہے مری ناؤ منجدھار میں
یہاں تک تجھے اب ہے آنا ضرور — مجھے مشکل ہے اب دکھانا ضرور

ناگمت اور پدماوت کی نوک جھونک :

جائسی کی پدماوت کا سب سے دلچسپ حصّہ وہ ہے جہاں ناگمت اپنے باغ کی سیر کی دعوت پدماوت کو دیتی ہے۔ اس سوتیا ڈاہ سے کہ باغ کی سجاوٹ دکھا کر پدماوت کو شرمندہ کرے۔ جائسی کے پاس اس واقعہ کا بیان حسبِ ذیل الفاظ میں ملتا ہے :- "ناگمت نے اپنے باغ کی تعریف غرور سے کی تو پدماوت نے ہنس کر کہا۔ تمہاری پھلواری اچھی تو ہے لیکن تعریف کے قابل نہیں۔ جہاں ناگیرا اور مالتی کے پھول ہوں وہاں سگندھرا کیوں، جس جگہ آم کے درخت ہوں وہاں نارنگی کیسی؟ جہاں پھول دار درخت ہوں وہاں پھلدار درخت کا کیا کام؟ ناگمتی نے جواب دیا :
میرے باغ کو الزام دیتی ہو۔ میں اگر اعتراض کر بیٹھوں تو تمہارا منہ سوکھ جائے۔ دو شاخیں جب رگڑ کھاتی ہیں تو آگ نکلتی ہے تجھ دشمن اور میرا کیا ساتھ۔ تو اپنی حد میں رہ مجھ سے لڑائی پر کیوں تلی ہے۔ میں رانی ہوں میرا شوہر راجا ہے۔ تو کون ہے؟ جس کا خصم جوگی ہے۔
پدمنی جل کر بولی :
میں پدمنی مانسرور کا کنول ہوں۔ بھونرا اور ہنس میری خدمت کرتے ہیں۔ میں پوجے جانے والی چیز ہوں۔ تو ناگن زہر بھری، جہاں

کھڑی ہو وہاں سیاہی لگ جائے۔ میں اسی ڈر سے تیرے پاس
نہیں بیٹھتی کہ میں بھی کہیں سانولی نہ ہو جاؤں۔ رات بھر جل جل کے
تو پیاسی مرتی ہے جب صبح ہوتی ہے تو شوہر کی بوپاتی ہے۔
ناگمت بولی :
کنول تو میں ہوں۔ آفتاب میرا شوہر ہے۔ میں اس سے خوش وہ
مجھ سے خوش۔ جو دن والی ہے شوہر اسی کے پاس آنا چاہے۔ رات
کی کیا حقیقت ہے جس میں کچھ نظر نہیں آتا۔
پدمنی نے دعویٰ کیا :
"میں نے سارے زمانہ کا حسن جیت لیا ہے۔ زلفیں، سیاہ ناگن سے
آنکھیں ہرن جیسی ہرن سے، کوئل سے گلا، سارس سے گردن،
چیتے سے کمر، اور ہنس سے چال میں نے پائی ہے۔
ناگمتی اس کی ہنسی اڑاتی ہوئی بولی :
پرائی زینت پر کیا اتراتی ہو جن کی یہ چیزیں ہیں اگر وہ لے لیں
تو تیرے پاس کیا رہ جائے گا۔ میں سانولی ہوں۔ سانولا رنگ
ملیح ہوتا ہے۔ تو میرے مقابل ایک پھیکی کلی ہے۔
پدماوت جھلا گئی تنک کر کہا :
ناگمتی زیادہ نہ بک۔ بس کر اپنی کہتھا۔ اسی طرح دونوں ایک دوسرے
کو للکارنے لگیں۔ دونوں کی باہوں کا زور ہونے لگا۔ سینہ
سینہ مقابل ہوئیں تو جھکائے نہ جھکتی تھیں۔ محرم کے بند
ٹوٹ گئے۔ دو مست ہاتھی ایک دوسرے سے بھڑ گئے "۔[1]

---

[1] شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی ۱۹۶۱ء

تحفۂ خلیل میں سوتنوں کی اس لڑائی کا نقشہ بڑے مزیدار انداز میں کھینچا گیا ہے۔ جائسی کے بیان میں اتنی دلفریبی اور دلکشی نہیں ہے۔ خلیل نے ان کے مکالموں میں بڑی جان ڈالی ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

ناگمت
مرے باغ کا کوئی ہمسر نہیں — کوئی باغ اس کے برابر نہیں

پدماوت:
مگر تم کو کہنا یہ زیبا نہیں — کوئی باغ ابھی تم نے دیکھا نہیں
سراندیپ میں جو مرا باغ ہے — عجب پُر فضا دلکشا باغ ہے
مقابل اگر اس کے یہ باغ ہو — تو لالہ سا ہر پھول میں داغ ہو
مجھے سخت حیرت ہے اس بات کی — کہ مدحت سرا تم ہو کس باغ کی
ستائش کے قابل تو گلشن نہیں — کسی پھول پر اس کے جوبن نہیں
یہ کیوں پیڑ اتنے لگائے گئے — گھنے اس قدر کیوں اگائے گئے
یہ بے میل ہر ایک نکالا ہے کیوں — یہ سوسن کے تختے میں لالا ہے کیوں
چنبیلی یہاں اور بیلا وہاں — ہزارا یہاں اور گیندا وہاں
یہ نسرین سے ہے نسترن کو لگ — پڑی ہے وہاں یاسمن یوں الگ
یہی سیب کی یاں ضرورت تھی کیا — شریفے لگانے کی حاجت تھی کیا
نہیں کوئی تختہ بری عیب سے — جو کیاری ہے وہ ہے بھری عیب سے

ناگمت:
مجھے رنج دینے کی گھاتیں ہیں یہ — حسد کی عداوت کی باتیں ہیں یہ
امارت نفاست کی لیتی ہو تم — یہی ہر گھڑی چھیڑ دیتی ہو تم
کبھی یوں نہ ہوگا تمہارا چمن — نہ اس طرح ہوگا سنوارا چمن
سجاوٹ کو تم جانتی ہی نہیں — چمن باغ پہچانتی ہی نہیں

پدماوت
تمہاری نہ ابتک یہ خصلت گئی — اُلجھنے کی سب سے نہ عادت گئی
پرندے گو بنہ کی بھی کھا چکیں — تکبر کی اپنی سزا پا چکیں

ناگمتی

بھلا مجھکو آخر ندامت ہو کیوں ... مجھے اپنے دعوے پہ خجلت ہو کیوں
مری تجھ سے کیا کچھ ہے صورت بُری ... ملاحت بُری ہے کہ رنگت بُری
تری طرح گو گوری چٹی نہیں ... مگر میں غضب کی ہوں ہٹی نہیں
نمک جو میرے سانولے پن میں ہے ... جو جادو مری ترچھی چتوں میں ہے
تجھے حشر تک بھی میسر نہیں ... حسیں کوئی میرے برابر نہیں
نہ شوخی ہو جس میں وہ عورت ہی کیا ... نمک ہو نہ جس میں وہ صورت ہی کیا

پدماوت

وہ بولی کہ چل ہٹ سرک دور ہو ... بہت اب نہ بیہودہ بک دور ہو
بڑی ایک یہ حسن والی ہوئی ... جہاں میں یہ سب سے نرالی ہوئی
مرا جا کے راجا سے تو حال پوچھ ... مرے حسن کا اس سے احوال پوچھ
لیا تھا یہ جوگ اس نے کس کے لئے ... کہ پہنچا سراندیپ مرے لئے
زمانے میں مجھ سا حسیں کون ہے ... مری طرح زہرہ جبیں کون ہے
پری سامنے میرے آتی نہیں ... کبھی حور آنکھیں ملاتی نہیں
مرے آگے تیری حقیقت ہے کیا ... ستارے کو ذرے سے نسبت ہے کیا
زمانے میں جہاں میں عجب چیز ہوں ... نئی چیز ہوں منتخب چیز ہوں
کٹاری سے بڑھ کر نظر ہے مری ... رگ گل سے نازک کمر ہے مری
ہزاروں میں ہے ایک صورت مری ... زمانے میں ہر سو ہے شہرت مری

خلیل نے جائسی کے بیان کو جو بہت ہی مختصر ہے دراز کیا ہے اور سوتنوں کی لڑائی کو نسوانی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے اس دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

علاؤالدین کا آئینہ میں پدماوت کا عکس دیکھنا:

سلطان علاؤالدین اور پدمنی کا یہ واقعہ اگرچہ تاریخی کم اور افسانوی زیادہ ہے لیکن بعض تاریخوں اور روایتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ جائسی کی پدماوت کا دوسرا حصہ اسی تذکرہ کے گرد گھومتا ہے۔ پدماوت کا عکس آئینے میں سلطان نے کس طرح دیکھا جائسی اسے یوں بیان کرتے ہیں:

"علاؤالدین نے رتن سین سے صلح کرلی۔ رتن سین نے بادشاہ کو قلعہ کی سیر کی دعوت دی اور بڑا اہتمام کیا۔ بادشاہ نے جہاں قیام کیا وہاں دیوار میں ایک آئینہ لگا دیا تاکہ جو بھی جھروکے میں آئے نظر پڑ جائے۔ راجہ اور بادشاہ بظاہر چوسر کھیلتے تھے لیکن بادشاہ کا دل آئینہ میں لگا تھا۔ پدماوت کی سہیلیوں نے جو دعوت کے اہتمام میں تھیں پدماوت کو بتایا کہ دہلی کا بادشاہ چتوڑ کے قلعہ میں آیا ہے تم بھی چل کر اس کو دیکھ لو کہ دیکھنے کی حسرت نہ رہے۔ پدماوت بناؤ سنگار کرکے جھروکے میں آ بیٹھی۔ جوں ہی چلمن سرکائی بادشاہ نے اس کا عکس آئینہ میں دیکھ لیا۔ آنکھ ملتے ہی ایسا مسحور ہوا کہ غش کھا گیا۔"

بتخانۂ خلیل اور شمع و پروانہ دونوں مثنویوں میں اسے مختلف طریقے پر منظم کیا گیا ہے۔

شمع و پروانہ	بتخانۂ خلیل
رتن سے کرکے فوراً کچھ بہانہ	ہوا بادشہ جلوہ فرما وہیں
منگا کر جلد آئینہ و شانہ!!	گئے جم سب اعلیٰ و ادنیٰ وہیں
رکھا اپنے روبرو آئینہ اک بار	اک آئینہ سلطاں کے خدام نے
کیا شانہ پھر اپنی باندھی دستار	وہیں رکھ دیا شاہ کے سامنے

یہ تعلیم راجہ کے دشمن کی تھی — کہاں راجہ کو عقل نکتہ چینی

یہ تدبیر راگھو برہمن کی تھی — سمجھا شہ کی وہ جو چال ایسی

کہا تھا کہ جب آپ واں جائیں گے — غرض وہ سادگی سے فارغ البال

قیام اس جگہ کچھ جو فرمائیں گے — نگہ برپا کھڑا تھا شاد و خوشحال

تو وہ محل سنے گی یہ اندر ضرور — برنگ آئینہ با چشم حیراں

وہ جھانکے گی کوٹھے پہ چڑھ کر ضرور — ادھر یہ منتظر بیٹھا تھا سلطاں

رہے گا جو یہ آئینہ سامنے — کہ اس میں وہ پدم کو شاد و خرم

تو عکس اس کا آجائے گا سامنے — لگی ترغیب دینے اسکی ہمدم

ہوا واقعہ در حقیقت یہی — کہاں دہلی کا سلطاں یاں تک آئے

شہنشہ کو پیش آئی صورت وہی — عبث تیرے لئے زحمت اٹھائے

پس پشت سلطاں کے در تھا کوئی — وہ زیر غرفہ اب بیٹھا ہے آکر

اسی سمت واقع تھا منظر کوئی — چلو تو دیکھ لیویں اس کو جاکر

اسی کے وہ چلمن سے جا کر لگی — غرض لے ساتھ کتنی ماہ پارہ

ادھر جھانکنے وہ گل تر لگی — لب بام آئی وہ بہر نظارہ

چھپا حسن اس کا نہ چلمن سے وہ — دریچے سے جونہی چلمن اٹھائی

پڑا شہ کے آئینے پر چھن کے وہ — سراپا صورت آئینے میں آئی

پڑا عکس کیا شہ پہ بجلی گری — نظر پڑتے ہی اس کو غش سا آیا

الٹ کر سر خاک کرسی گری — کہے تو ہو گیا پریوں کا سایا

سراپا:

مثنویوں میں سراپا لکھنے کی رسم عام ہے۔ داسوخت میں تو سراپا نویسی اپنے انتہائے کمال کو پہنچتی ہے۔ بعض شاعروں نے صرف سراپا میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔

طویل عشقیہ بیانیہ نظموں میں سراپا بیان کرنے کے اچھے مواقع ملتے ہیں۔ ہندی اور سنسکرت میں بھی "مکھ سکھ" کے نام سے یہ صنف بہت رائج ہے۔ کالیداس نے شکنتلا کا جو سراپا کھینچا ہے اس کو پڑھ کر ایک یورپی تنقید نگار لکھتا ہے کہ کالیداس کے اشعار سے شکنتلا کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اتنی حسین اور نازک عورت کا تصور کوئی ادب نہیں پیش کر سکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جائسی نے سنسکرت ادب سے استفادہ کر کے اپنی پدماوت کا سراپا نظم کیا ہے اور اتنی نازک خیالیاں اس میں بھر دی ہیں کہ وہ اردو ادب کے لیے انوکھی چیز ہو گیا۔

ملک محمد نے پدماوت کا سراپا بڑی محنت اور فرصت سے لکھا ہے۔ یہ سراپا بہت زیادہ طویل ہے۔ ایک ایک عضو کی صراحت و وضاحت میں متعدد اشعار نظم کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ سراپا پدماوت میں دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک توتے کی زبان سے رتن سین کے سامنے، دوسرے راگھو برہمن کی زبان سے علاؤالدین کے سامنے۔ تشبیہوں استعاروں کی ندرت و جدت اور معنویت کے ساتھ ہندی مذاق تسلیم کا جو طور ان دونوں سراپا میں ملک نے اختیار کیا ہے اس کا اندازہ سراپا کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے اس طویل سراپا کا خلاصہ یہ ہے:

> "چہرہ، سورج کی طرح نہیں سورج ہے۔ کوئی نظر بھر کر اُسے نہیں دیکھ سکتا[1]۔ اس کے کنول جیسے بدن کو ہوا چھو کر درخت کو لگے تو درخت مہکنے لگے۔ بالوں کا پیچ و خم سانپ کا سا ہے۔ نرم گرہ دار زلفوں کے سانپ لہریں لیتے ہوئے پھن نکالے ہیں گویا صندل کی خوشبو میں آلودہ ہیں۔ یہ گھونگھریالی زلفیں، لہر

---

[1] اس موقع پر جلیل مانکپوری کا یہ شعر یاد آتا ہے

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں ÷ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

میں بھری ہوئی زنجیریں ہیں جس کی گردن میں پھندا پڑا وہ اس کا غلام ہوا۔

مانگ سورج کی ایک کرن ہے جو آکاش پر نمودار ہے۔ جمنا سے گویا سرسوتی ندی آملی ہے۔ اس پر جو پروئے ہوئے موتی ہیں گویا جمنا کے اندر گنگا کا من۔ سیندور بھری مانگ گویا اندھیری رین میں دیا کی جوت۔ یا کسوٹی پر سونے کی لکیر گھنگھور گھٹا میں بجلی کا کوندا۔ اس کے سر کی چوٹی کی طرف سانپ دیکھے تو اس کے پاؤں پر گر پڑے۔ چوٹی جب وہ کنگھی کرنے کو کھولتی ہے تو دنیا چراغ روشن کرلیتی ہے۔

اس کی پیشانی کو ہلال کیوں کہوں۔ ہلال میں اتنی روشنی کہاں ہزار حصّہ اگر سورج روشن ہو اس کی پیشانی کو دیکھ کر چھپ جائے۔ چاند اس کے مقابل نہیں ہوسکتا اس لیے اماوس میں غائب ہوجاتا ہے۔ مہادیو بھی اس کے سامنے سر بسجدہ ہیں۔ بھویں گویا سیاہ کمانیں کھنچی ہیں جس کی طرف دیکھا زہر کا بان مارا۔ اسی کمان سے راون مارا گیا! اسی کمان نے کنس کا سر اُتارا۔ وہ بھویں ہلائے تو پربت اپنی جگہ سے ٹل جائے۔ پلکیں گویا دو فوجیں مقابل کھڑی ہیں۔ رام اور راون کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوگئے۔ آنکھیں دونوں گویا گہری جھیلیں ہیں۔ سُرخ کنول سمجھ کر بھونرے اس پر منڈلاتے ہیں! اگر گردش کریں تو آسمان کو اُلٹ دیں۔

ناک اس کی دیکھ کر توتا شرماتا ہے۔ جتنے پھول خوشبودار ہیں سب اُمید لگاتے ہیں کہ شاید ہم کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے۔ لب ایسے کہ لالۂ صحرائی انھیں دیکھے تو جنگل میں جا چھُپے۔ بات کرنے

کے لیئے جب وہ اپنے سُرخ لب کھولتی ہے تو ان سے رنگ ٹپکتا
ہے۔ اس کے لب سے نکلی ہوئی باتیں سُن کر سیپیاں موتیوں سے
بھر جاتی ہیں۔
دانتوں سے کرن پھوٹتی ہے جیسے بہاروں کی رات کی بجلی ہیرا
ان دانتوں کے عکس سے روشن ہوجاتا ہے۔ انار ان کی برابری نہیں
کر سکا رشک سے اس کا سینہ چاک ہوگیا۔
رخسار کیا ہیں نارنگی کے دو ٹکڑے ہیں۔ بائیں رخسار پر جو تل ہے
گویا آگ کا تیر ہے۔ اس تل سے جس نے دشمنی کی وہ عمر بھر جلتا
رہا۔ قطب تارا اُسے دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔ کبھی نکلتا ہے
کبھی ڈوبتا ہے لیکن تل اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں جاتا۔
سینہ تھال ہے اور پستان سونے کے کٹورے۔ گویا ایک تخت پر
دو راجا بیٹھے ہیں۔ بھونرا جس طرح اپنا ڈنک کیتکی کے پھول میں
چبھوتا ہے اسی طرح پستانیں محرم میں چھید کیا چاہتی ہیں۔ آبحیات
سے بھرے ہوئے دو کوزے انگیا میں بند ہیں۔ دو آتشیں تیر گویا
کمان سے نکلنے کو بے چین ہیں۔ اگر بند نہ ہوں تو زمانے بھر کو
مجروح کر ڈالیں"۔ [1]

اس قسم کا تفصیلی سراپا بہت کم اردو مثنویوں میں نظر آتا ہے۔ ابتدائی مثنویوں
میں میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" میں مکمل سراپا ملتا ہے جس کے تقریباً تین سو شعر
ہوں گے۔ سراپا کے لیے زیادہ تر فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں مگر ہندی تشبیہوں سے
بھی کام لیا ہے مثلاً:

---

[1] شیخ احمد علی۔ پدماوت بخط فارسی ۱۹۶۱، ص ۹۵ تا ۱۱۰ ـــ ۴۵۲ تا ۴۵۵

کہی جاتی نہیں کمر کی لچک — پائی چیتے نے کب یہ ایسی چمک
یوں سیہ مست جھولے آتے ہیں — مست جوں ہاتھی ہولے آتے ہیں
مانگ ہوتی بھری وہ دے ہے بہار — جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار

سراپا میں کوئی عضو نہیں چھوڑا اور اس دھن میں وہ حد سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔
میر حسن نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ مختصر لکھا ہے نسیم کے اختصار نے سراپا کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

خلیل کے یہاں قدرے تفصیل ملتی ہے لیکن انھوں نے جائسی کی نازکخیالیوں اور تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے تخیل سے کام لیا ہے۔ اپنے سراپا کو اعضائے جسمانی تک محدود نہیں رکھا ہے۔ اس میں نکھ سے سکھ تک اعضائے جسم کے نشیب و فراز بیان کرنے کے علاوہ تمکنت۔ بانکپن۔ چھبن۔ نازوادا۔ تغافل۔ حیا۔ شوخی۔ تبسم اور غرور کی اداؤں کو بھی سراپا میں شامل کیا ہے۔ ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ ہندوستانیت اور اس کے سوندھاپن کی جگہ ایرانی رنگ غالب ہے۔ شمع و پروانہ کے سراپا میں بھی فارسی مثنوی کی تقلید جھلکتی ہے۔

بتخانۂ خلیل

ڈھلا اس کا سانچے میں سارا بدن
بہاروں سے بھی بڑھ کے پیارا بدن
نظر کہہ رہی ہے کہ نشتر ہوں میں
چھری سے کٹاری سے بڑھ کر ہوں میں
وہ مانگ اس کی ہے راہ ظلمات کی
جبیں چاندنی چودھویں رات کی
قیامت کی شوخی بھری آنکھ میں
جوانی کی مستی بھری آنکھ میں

شمع و پروانہ

نظر جس کو پڑا اس کا سراپا
دہیں دل سے اٹھا اسکے بھبوکا
کماں ہیں تیغ ابرو ہیں کہ کیا ہیں
ہلال نوک محراب و عصا ہیں
وہ بادام سیہ یا چشم جادو
ہیں صیاد جہاں آنکھیں کہ آہو
دل اسکی مانگ کے رشتے ہیں ششدر
کہ آدھی رات اندھیری جائیں کیدھر

وہ لب اس کے یاقوت سے لال ہیں
وہ بے پان کھائے ہوئے لال ہیں

ملائم ہیں دست حنائی بہت
نزاکت لئے ہے کلائی بہت

جبیں شمع کی لو سے بھی ناک ہے
عیاں صفت ایزد پاک ہے

عجب اس کا منہ ہر عجب دانت ہیں
ڈھلے ایک سانچے میں سب دانت ہیں

ذہن نور کا دونوں لب نور کے
جو اعضا بدن کے ہیں سب نور کے

نہ بیلے کی کلیاں حسیں اس طرح
نہ موتی کی لڑیاں حسیں اس طرح

وہ رانیں بھری چکنی چکنی سڈول
بہت ہی مناسب بہت ہی سڈول

وہ تلوے کہ آئینہ حیران ہے
صفائی پہ دونوں کی قربان ہے

دُر دنداں دہن میں یوں ہیں باہم
نہاں غنچے میں جوں قطرات شبنم

جو آہو گردن اسکی دیکھ پائے
خجالت سے نہ پھر گردن اُٹھائے

مسی مالیدہ لب وہ اور دنداں
سرِ ابر سیہ برق درخشاں

حباب چشمۂ خوبی وہ پستاں
دیا ہیں دو انار باغِ رضواں

کمر کا اور سرین کا ہے وہ عالم
کہ دو موتی ہیں اک رشتے میں باہم

وہ نازک کان میں جو بالیاں ہیں
جھکی پھول اور پھلوں کی ڈالیاں ہیں

نہ پہنچا ناف تک اس کے قیافہ
کہ تھا وہ حسن کے آہو کا نافہ

حیا آگے ہے بس اب منع کرتی
سر عجز اپنا ہے زانو پہ دھرتی [1]

---

[1] یہاں سحر البیان کا سراپا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

منظر نگاری

منظر نگاری:

منظر نگاری کو مثنوی کا اہم جز و مانا جاتا ہے۔ مثنوی میں جو کچھ بیان کیا جائے ضروری ہے کہ اس کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔ داستان میں جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت اور مناظر حسن و دلکشی کی تصویر کشی کے مواقع آتے رہتے ہیں۔ ملک محمد جائسی نے فراق و وصل کی کیفیات اور جذبات کی تصویر کشی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ صبح و شام یا چاندنی رات پر نظم نگاری نہیں کی ہے "بارہ ماسہ" میں موسموں کا ذکر کیا ہے تو اسے ناگمت کے فراق میں ڈبو دیا ہے۔ خلیل اور عشرت نے فارسی مثنویوں کی تقلید میں منظر نگاری کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ کئی مواقع پر اچھے نمونے پیش کئے ہیں جو فطرت کے عین مطابق ہیں۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ بہت لطف دیتی ہے۔

باغ کا منظر

بتخانۂ خلیل میں پدمنی کے باغ کا منظر بڑی لطافت سے نظم کیا گیا ہے۔ خلیل نے میر حسن کے اسلوب کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انداز بیان ایسا ہے کہ دونوں کے اشعار ایک دوسرے کا گمان ہوتا ہے۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ دلچسپ ہوگا۔

بتخانۂ خلیل	سحر البیان
وہ گلزار بھی معدن نور تھا	ہوائے بہاری سے گل لہلہے

تجلّی وہ گُلشن طور تھا　　چمن سارے شاداب اور ڈہڑ ہے
کہیں ارغواں تھا چنبلی کہیں　　زمرد کے مانند سبزے کا رنگ
مہکتی تھی جوہی اکیلی کہیں　　روش پر جواہر لگے جیسے سنگ
نہ خالی تھی پھولوں سے تِل بھر زمیں　　چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
گلوں سے سوا تھی معطر زمیں　　کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمن
ہوا سے تھیں شاخیں کھلی اسطرح　　چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
جھکائے دلہن ہو نظر جس طرح　　کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
مدن بان کی اور ہی شان تھی　　کہیں جعفری اور گیندا کہیں
وہ بوباس تھی عقل حیران تھی　　سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
مہک اس کی سارے چمن سے جُدا　　کھڑے سرو کی طرح حِنا کے جھاڑ
سمن سے جدا یاسمن سے جُدا　　کہے تو کہ خوشبوؤں کے پہاڑ
مئے ناب کا تھا اثر پھول میں!　　گلوں کا لب نہر پر جھومنا
مہک ساغر مل کی ہر پھول میں!　　اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
دوا پھول ہر زخم ہر داغ کی　　چمن آتش گل سے دہکا ہوا
بہار ایک غنچے میں سو باغ کی　　ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

چاندنی رات کا منظر

ہر اک سمت پیہم برستا ہے نُور　　چھما چھم چھما چھم برستا ہے نور
جدھر دیکھئے نوری نور ہے　　شجر جو ہے نخل سر طور ہے
وہ شب ہے کہ دن سے ہے روشن سوا　　شب قدر سے جلوہ افگن سوا
یہ کہتے ہیں ذرے ستارے ہیں ہم　　حسینوں کی آنکھوں کے تارے ہیں ہم
سر آسماں ہے داماغ زمیں　　مہ چار دہ ہیں چراغ زمیں

عملداری نور ہے ہر طرف — سیاہی زمانے سے ہے برطرف
فدا ہو رہی ہے چمک ماہ پر — گماں کہکشاں کا ہے ہر راہ پر
چمکتا ہے مہتاب اس شان سے — کہ قربان تارے ہیں سو جان سے
فلک حسن پر اپنے مغرور ہے — جو تارہ ہے خال رخ حور ہے

موسم گرما کا منظر

وہ دن جیٹھ بیساکھ کے اور وہ دھوپ — ہر اک شے تھی بدلے ہوئے اپنا روپ
جگر خشک ہوتے تھے لب کی طرح — سیہ فام دن بھی تھا شب کی طرح
بڑا دھوپ کا زور دنیا میں تھا — سمندر بھی پوشیدہ دریا میں تھا
جو غنچہ تھا شاک اس پہ تھا خار کا — جو تپتا تھا چہرہ تھا بیمار کا
تپش سے تھے چھالے جگر میں پڑے — پھپھولے تھے پائے نظر میں پڑے
وہ چلنا وہاں لو کا اللہ رے — چمکنا وہ بالو کا اللہ رے
ہوا آگ تھی، ہر مکاں آگ تھا — زمیں آگ تھی، آسماں آگ تھا
یہ سوزش تھی چھالے گہر ہو گئے — جو ذرے اڑے وہ شرر ہو گئے
درختوں کے سب پھول پھل چھن گئے — اڑے جو پرندے وہ جل بھن گئے
ہرا نخل کوئی نہ پایا کہیں — نظر سبز تپا نہ آیا کہیں

رقص و نغمہ کا منظر

رتن سین اور پدماوت کی شادی کے موقع پر خلیل نے ناچ گانے کا منظر بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ سحر البیان میں بھی یہ منظر ملتا ہے۔

سحر البیان	تبخانۂ خلیل
وہ رقص تپاں اور وہ ستھری ادا	بلائے تھے دو طائفے نور کے

کہ جس کو ملے تھے گلے نور کے
انھیں جس گھڑی ناز و انداز سے
چلی راگنی پردۂ ساز سے
جدھر جھک پڑیں اک ستم ڈھا دیا
کلیجوں کو سینے میں تڑپا دیا
زمیں پر نہ آہستہ ٹھوکر پڑی!
جو ٹھوکر پڑی وہ جگر پر پڑی
ہر اک کو ادائیں دکھانا انھیں
دلوں کو لبھانا، رجھانا انھیں
کوئی شوخ سرمایۂ ناز تھی!
کوئی حاکمِ ملکِ انداز تھی
کوئی نازنیں دلربا دلفریب
سب اربابِ محفل ادھر وجد میں
سرِ چرخ زہرہ ادھر وجد میں
شرارت وہ ان شاطروں کی غضب
وہ مجلس کبھی کیا لطف انگیز تھی
بڑی دلکش تھی دل آویز تھی

وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
خوشی کی نہ بس ہر طرف تھی بساط
لگے ناچنے اس پہ اہلِ نشاط
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے
وہ پاؤں کے گھنگھرو چھمکتے ہوئے
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال
کمر کی لچک اور مہک کی وہ چال
وہ بڑھنا وہ گھٹنا اداؤں کے ساتھ
دکھانا وہ رک رک کے چھاتی پہ ہاتھ
کبھی دل کو پاؤں سے مل ڈالنا
نظر سے کبھی دیکھنا بھالنا
کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا
دوپٹہ کو کرنا کبھی منہ کی اوٹ
کہ پردے میں ہو جائے جی لوٹ پوٹ
وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
عجب ایک عالم تھا بے ساختہ
کہ عالم تھا اک اس پہ جاں باختہ

پدماوت کی باغ کی سیر کا منظر:

چلی اس ادا سے وہ سوئے چمن
بڑھی پیشوائی کو بوئے سمن
اداؤں پہ گل جان دینے لگے
قدم فتنے اٹھ اٹھ کے لینے لگے
ٹھہرتی ٹہلتی، چمکتی چلی
کمر ہر قدم پر لچکتی چلی

دوپٹے کا آنچل لٹکتا چلا — وہ گوٹا سنہرا جھلکتا چلا

وہ دھانی دوپٹہ وہ لچکے کی گوٹ — ستم ڈھا رہی تھی پڑاقے کی گوٹ

جفا ساتھ شوخی حیا ساتھ ساتھ — کرشمہ نزاکت ادا ساتھ ساتھ

دلِ باغ کو داغ دیتی ہوئی — گل و غنچہ کی جان لیتی ہوئی

رخِ گل پہ افسردگی چھا گئی — کلی جو کھلی تھی وہ مرجھا گئی

اڑا رنگ پر پھول سے بو کیطرح — ندامت سے سمٹے لجالو کیطرح

کوئی گل نہ تھا جو پشیماں نہ تھا — سلامت کسی کا گریباں نہ تھا

پدماوت کے سونے کا منظر :

قیامت کا سونا حسینوں کا ہے — ستم انیڈنا نازنینوں کا ہے

ستم ڈھا رہی ہے جوانی کی نیند — وہ مستی بھری شادمانی کی نیند

لگی صاف چادر ہے قالین پر — چنے پھول ہیں کچھ ادھر کچھ اُدھر

گلے میں ہے ہار اک معطر پڑا — دوپٹہ ہے ململ کا منہ پر پڑا

مگر لی ہیں جو کروٹیں ناز سے — تو کچھ ہٹ گیا ہے وہ انداز سے

بکھر کر پڑے کچھ ہیں چہرے پہ بال — ڈھکے ان سے کچھ پھول سے ہیں وہ گال

مگر بال لپٹے جو ہیں پیار سے — دبے ہیں جو تکیے پہ رخسار سے

تو ظاہر ہیں گالوں پہ سارے نشاں — نظر آتے ہیں پیارے پیارے نشاں

وہ جوبن جو تنگی کے گھبرائے ہیں — تو انگیا سے کچھ کچھ نکل آئے ہیں

پدماوت کے بناؤ سنگار کی منظر کشی :

پدماوت کے دلھن بننے کی سجاوٹ کا نقشہ اور بدر منیر کی بے نظیر سے پہلی ملاقات کے وقت آرائش کا سماں نبلیل اور میر حسن کے یہاں دیکھئے۔

بتخانۂ خلیل

وہ پیاری دلھن کی بناوٹ ستم
وہ پوشش ستم وہ سجاوٹ ستم
وہ سب عطر میں اسکا ڈوبا لباس
وہ سہرے کا عالم وہ سوہا لباس
وہ دلکش مہک پھول کے ہار کی
تجلی وہ گھونگھٹ میں رخسار کی
وہ زلفیں وہ جوڑے کی بندش غضب
وہ قد اسکا آفت وہ پوشش غضب
لچکنا کلائی کا کنگن سے وہ
نیا روپ بازو پہ جوشن سے وہ
وہ جھمکوں کا کچھ جھومنا بار بار
وہ بے پوچھے منہ چومنا بار بار
وہ دست حنائی کی رنگت ستم
وہ چھلوں کی پوروں میں کثرت ستم
بدن جابجا سے چھپائے ہوئے
نمودار چیزیں چرائے ہوئے
لبوں پر تبسم وہ ہر بات میں
بھرا رس وہ ابھری ہوئی گات میں

سحر البیان

وہ مکھڑے کا عالم وہ کنگھی کا رنگ
شب ماہ ہو دیکھ کر جسکو دنگ
وہ مستی وہ اس کے لب لعل فام
سواد دیار بدخشاں کی شام
وہ پشواز اک ڈھنگ کی جگمگی
ستاروں کی کفنی آنکھ جس پر لگی
جو دیکھے وہ انگیا جواہر نگار
فرشتہ ملے ہاتھ بے اختیار
وہ باریک کرتی مثال ہوا
عیاں ہو بہ ہو جس سے تن کی صفا
مغرق زری کا وہ شلوار بند
ثریا سے تابندگی میں دو چند
وہ چھب تختی اس کی نزاکت نہاد
چمن زاد قدرت کا نخل مراد
بھری مانگ موتی سے جلوہ کناں
نمایاں شب تیرہ میں کہکشاں
وہ بالوں کی بو رشک مشک ختن
وہ ڈوبا ہوا عطر میں اسکا تن

میدان جنگ کی منظر کشی :

نکل کر جواں پہلی صف سے چلے
جوانمرد دونوں طرف سے چلے

سنبھلتے ہی ہتھیار چلنے لگے | بہم دار پر دار چلنے لگے
چھنا چھن کی آواز آنے لگی | اجل ہاتھ اپنا بڑھانے لگی
برسنے لگا خون میدان میں | ہزاروں ہوئے قتل اک آن میں
کوئی ہو کے زخمی گرا تیر سے | تڑپنے لگا کوئی شمشیر سے
کہیں پار دل کے سنان ہو گئی | کہیں کھنچ کے دہری کمان ہو گئی
گئی جس طرف تیغ سن سے نکل | گئی خوف سے جان تن سے نکل
چمک کر کبھی تیغ سر پر پڑی | کبھی ہو کے ترچھی کمر پر پڑی
کلائی کسی کی کہیں اڑ گئی | وہ ہاتھ اڑ گیا آستین اڑ گئی
کہیں تن سر وہیں سے کٹ کر گرا | کہیں تن سناں سے الٹ کر گرا
ٹپکتا تھا سر سے جبیں سے لہو | گریباں سے آستیں سے لہو

ساقی نامہ :

مثنوی میں ساقی نامہ کی روایت جب استعمال ہوتی ہے تو اس سے وہ اشعار مراد ہوتے ہیں جو داستان کے ذیلی عنوانات کی ابتداء میں بادہ و ساغر کی اصطلاح میں موزوں کئے جاتے ہیں اور اس کا ربط آئندہ آنے والے واقعات سے قائم کیا جاتا ہے۔ جائسی کی پدماوت اس سے عاری ہے البتہ خلیل اور عبرت وعزت نے اس کا التزام کیا ہے جو فارسی اور اردو مثنویوں کی تقلید میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آزی اور رتبہ می کی فارسی مثنویوں سے بھی یہ اسلوب لیا ہو۔

ساقی نامہ وہی بہتر خیال کیا جاتا ہے جو واقعہ کے متن سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اور ان اشعار کو پڑھ کر قاری کو یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب بیان کیا موڑ لینے والا ہے۔
مثال کے طور پر میر حسن "بے نظیر کے حمام میں نہانے" کی ابتداء یوں کرتے ہیں :

پلا آتشیں آب پیر مغاں | کہ بھولے مجھے سرد و گرم جہاں

اگر چاہتا ہے مرے دل کو چین — نہ دنیا وہ ساغر جو ہو قلتین
کدورت مرے دل کی دھو ساقیا — ذرا شیشۂ مے کو دھو دھا کے لا
کہ سرگرم حمام ہے بے نظیر — گیا ہے نہانے کو بدر منیر

یا کنوئیں سے بے نظیر کے نکلنے کے بیان کی تمہید میر حسن یوں قائم کرتے ہیں:

قدح بھر کے لا ساقی بانمیز — کنوئیں سے نکلتا ہے یوسف عزیز
گئے دن خزاں کے اور آئی بہار — مٹے لالہ گوں سے دکھا لالہ زار
گلابی چھلکتی پلا دے مجھے — سماں کوئی ایسا دکھا دے مجھے
کہ وہ ماہ بخشب کنوئیں سے نکل — منازل کو اپنے بھرے بر محل
اندھیرے سے نکلا وہ روشن بیاں — کہ حرفوں سے جوں ہوویں معنی عیاں

شمع و پروانہ میں بھی ساقی نامہ کی پابندی ہے مگر برائے نام ہے۔ زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ زیادہ تر ایک دو شعر تک محدود رکھا ہے۔ مثلاً پدماوت کی سیر باغ کی ابتدا صرف دو شعر ہی سے کرتے ہیں۔

اٹھ اب اے ساقی سرت خود کام — مئے عشرت سے بھر دے مجکو اک جام
سواری باغ میں آئی پدم کی — کروں تعریف اس پہ شک ارم کی

اس کے برعکس خلیل نے ساقی نامہ کا خاص اہتمام کیا ہے۔ ہر باب کی ابتداء میں بالالتزام کئی کئی اشعار مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے موزوں کئے ہیں۔ ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت خلیل کے ساقی نامہ درج کئے جاتے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پدماوت کا باغ کی سیر کو جانا:

بہار آئی ساقی گلستاں میں پھر — بھرے پھول گلچیں نے داماں میں پھر
اٹھی دیکھ وہ کالی کالی گھٹا — کلیجے پہ وہ چھانے والی گھٹا

وہ آتی ہے جھاجوں برسی ہوئی | نہ کیوں آب تاک سے بہتی ہوئی
نظر اس طرف کیوں یہ پڑتی نہیں | پری ہے تو کیوں بوتل اڑتی نہیں
اسی وقت تو لطف پینے کا ہے | نہیں تو مزہ کون جینے کا ہے
صراحی ملے آج وہ نور کی | بنی جس پہ ہو بیل انگور کی
کروں سیر نشے میں گلزار کی | نکالوں تمنا دل زار کی
کہ سیر چمن کو چلی پدمنی | لیئے ساتھ اپنے کنیزیں سبھی

آغاز داستان:

مئے ناب سے جام بھر ساقیا | مجھے بھی مرید آج کر ساقیا
بہت تو نے وعدوں پہ ٹالا مجھے | پلا آج اپنا پیالا مجھے
کروں جس سے دل سے اطاعت تری | ملی ہے نصیبوں سے خدمت تری
بنا تو بھی پورا شرابی مجھے | چھلکتی ہوئی دے گلابی مجھے
یہ غم جس سے میرا فراموش ہو | طبیعت بڑھے دل کو اک جوش ہو
دکھائے مزے خوش بیانی مری | فسانہ ہو ہر سو کہانی مری

ناگمت کا سنگار کر کے اپنے حسن پر مغرور ہونا:

ہوئی کب سے ساقی یہ نخوت تجھے | نہ تھی پہلے ایسی تو غفلت تجھے
کسی کو تو اب پوچھتا ہی نہیں | وہ ساغر نہیں وہ صراحی نہیں
خدا کے لیے اب خبر لے ذرا | دوائے قرار جگر دے ذرا
ترا ناز بیجا یہ بھاتا نہیں | تجھے یہ تکبر خوش آتا نہیں
اٹھا جام و مینا نہ اب دیر کر | خدارا مجھے سیر کر سیر کر
ہوئی ایکدن صبح جب آشکار | چلی ناگمت اپنا کرنے سنگار

پدماوت اور رتن سین کی شادی :

یہ کیوں میکدے میں ہے غل شور آج — خوشی کا یہ ساقی ہے کیوں زور آج
یہ کیوں رقص کرتا ہے جام اس قدر — بنا کب سے ہے میکدہ ناچ گھر
لگن دختِ رز کی بڑی کب سے ہے — خوشی کی یہ آئی گھڑی کب سے ہے
یہ دن تو بڑے عیش و عشرت کا ہے — زمانہ طرب کا مسرت کا ہے
وہ گلپوش مانجھے بٹھائی گئی — نظر سے چھپائی چرائی گئی

رتن سین کا سراندیپ سے رخصت ہونا :

پریشاں ہے ساقی طبیعت مری — ستاتی ہے اب مجھکو وحشت مری
بس اب میکدے سے دل اکتا گیا — مرا جی بہت یاں سے گھبرا گیا
تمنا ہے پھر اب سفر کی مجھے — ستاتی ہے اب یاد گھر کی مجھے
روانہ وہ خط کر دیا جب ادھر — تو پھر کر دیا اس نے قصد سفر

رتن سین کا طوفان میں آنا :

نہ کر ساقیا دیر ساغر اٹھا — اٹھا کشتیِ مے کا لنگر اٹھا
بڑے جوش پر مے کا دریا ہے آج — ہر اک لہر موجوں پہ کیا کیا ہے آج
بطِ مے ہے کیا تیرتی ہر طرف — گھٹا بھی ہے کیا اٹھ رہی ہر طرف
دکھا دے وہ دریا دلی تو بھی آج — کہ رہ جائے حسرت نہ کچھ دل کی آج
کہیں مے کی کشتی نہ چل کر رکے — نہ شیشہ رکے اور نہ ساغر رکے
چلا جب رتن سین سوئے وطن — اسے لے چلی آرزوئے وطن

رتن سین اور علاؤالدین کی جنگ :

پلا جلد اے ساقی مہرباں
کہ رنگ اب بدلنے پہ ہے آسماں

اٹھا اب مے وہ دے جس سے طاقت بڑھے
عوض نشہ کے میری ہمت بڑھے

فلک رنگ دیکھیں بدلتا ہے کیا
اب اس وقت یہ چال چلتا ہے کیا

ہوئی یارے کچھ کچھ عیاں صبح جنگ
لگی ہونے جلوہ فشاں صبح جنگ

رتن سین کا قید ہونا :

یہ میخانے میں آج ماتم ہے کیوں
یہ چھایا ہوا ساقیا غم ہے کیوں

یہ کیوں ہر طرف ہے خرابی پڑی
سر خاک کیوں ہے گلابی پڑی

یہ مے ہو گئی ہے لہو کس لئے
پڑے ہیں یہ اوندھے سبو کس لئے

خرابات میں کیوں یہ کہرام ہے
بھرے اشک آنکھوں میں کیوں جام ہے

رتن سین جب شہ کا قیدی ہوا
اسیرِ غمِ نا اُمیدی ہوا

بُتخانۂ خلیل پر تنقیدی نظر

تقابلی مطالعہ کے لیے جب ہم خلیلؔ سے قبل کی دو اہم مثنویوں پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سحرالبیان اور گلزارِ نسیم دونوں اپنی زبان اور اسلوب میں جُدا جُدا ہیں یہی ان کی انفرادیت بھی ہے۔ اسلوب خواہ کچھ نہ ہو سوال برتنے کا ہے۔ دونوں نے اپنی خصوصیات کو کمال تک پہنچایا اور دونوں نے عوام اور خواص کے دلوں میں اپنا گھر بنایا۔ ایک صنعتوں سے مزین ہے تو دوسرا سادہ اور بے ساختہ ہے۔

خلیل حسن خلیلؔ نے اپنی پدماوت میں نہ صرف اس بحر کو اختیار کیا جو میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کی ہے بلکہ اسلوب نگارش کی بھی تقلید کی۔ سادگی، صفائی اور سہل انگاری خلیلؔ کے عصری رجحانات کا تقاضا بھی تھا۔ لکھنؤ جہاں یہ مثنوی پدماوت لکھی گئی

وہاں ناسخیت کا زور کم ہوگیا تھا۔ شاعری میں رعایت لفظی اور ضائع بدائع سے گریز کی روش رائج ہورہی تھی۔ نسیم کی گلزار نسیم کے قبول عام کے باوجود اس کی تقلید کا خیال خارج از بحث تھا۔ مذاق سخن تمام اصناف سخن میں زبان کی سادگی اور بیان کی صفائی کا تھا۔ خلیل نے جانسی کی پدماوت کی منظوم کرنے میں اسی رجحان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر پیش نظر رکھا۔

"شمع و پروانہ" بھی اس وقت خلیل کے سامنے تھی جو سحر البیان کے دس بارہ سال بعد لکھی گئی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کی زبان سحر البیان کے مقابلہ میں صاف سادہ اور واضح نہیں۔ خلیل کی پدماوت ۱۹۱۴ء یعنی سحر البیان کے ایک سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت تک اردو زبان کے گیسو سنوارے جا چکے تھے نوک پلک درست کیے جا چکے تھے۔ لکھنؤ والوں کے ہاتھوں زبان و بیان کا نکھار اپنے عروج پر تھا۔ اس لیے بتخانہ خلیل کی زبان ان کے مقابل میں زیادہ پاک و صاف ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

شمع و پروانہ کے اشعار جو تقابلی مطالعہ میں پیش کیے جا چکے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی ترکیبوں کی بہتات، تعقید، ابہام اور الجھاؤ ہے زبان کی قدامت کی وجہ سے بھی ناہمواری کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے۔ روانی و چستی مفقود ہے۔ مصرع جھولدار ہیں۔ حشو و زوائد یعنی بھرتی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ امیر احمد علوی عبرت و عشرت کے بیان اور ان کی زبان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> روزمرہ اور محاورہ دونوں (عبرت و عشرت) کا قدیم ہے۔ متروک الفاظ دونوں استعمال کرتے ہیں۔ انت۔ جھک۔ برے لوہو۔ ہیگا۔ جوں اور انھوں وغیرہ۔ رعایت لفظی پر دونوں جان دیتے ہیں۔ محاورات کو نظم کرنے میں قواعد کا لحاظ نہیں رکھتے تعقید کو معائب سخن میں شمار نہیں کیا ہے۔ بعض الفاظ کی تذکیر و

"تانیث بھی رواج کے خلاف ہے۔"[1]

ذیل کے چند اشعار متذکرہ بالا بیان کے ثبوت میں ہیں۔

رگِ گل جس کفِ پا سے برون ہے
سو جور خار سے وہ غرقِ خوں ہے

پس از آوائے شوق صد ملاقات
بظاہر ہے برائے اُلفت آیات

غمِ اُلفت میں اس کے ہیں شب و روز
ہوں مہر و مہ سے با داغِ دل افروز

عجب صورت سے اسکو جا کے دیکھا
تعجب جس سے اس توتے کو آیا

انھوں کے بے خدمت عالی میں ہے عرض
اور ان پر بھی قبول عرض ہے فرض

بیاد روئے جاناں آخر کار
ہوئی پردے سے شب کے صبح اظہار

دُلھا دولہن نے مروارید کے ہار
گلے ڈالے ہیں یکدیگر طرحدار

چلے دہلی کی جانب بادلِ تنگ
بظاہر صلح لیکن پڑتے ہیں جنگ

خلیل امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اردو زبان پر انھیں قدرت حاصل تھی اس لیے انھیں ادائے خیال اور اظہار بیان میں کوئی دشواری نہ تھی۔ تقلید کے ساتھ انھوں نے جودت طبع سے کام لیا ہے اور طبعزاد مثنوی کی مانند اس میں اپنا رنگ سمویا۔ اشعار بہتے چشمے کی طرح رواں ہیں۔ محاورات اور روزمرہ کا استعمال برمحل اور شستگی کے ساتھ ہے۔ نمائش، تکلف اور تصنع کو جگہ نہیں دی ہے۔ بیشتر اشعار سہل ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں۔ بول چال کی زبان کا بھی خیال رکھا ہے۔ عام زبان لکھنا اور اس کو عامیانہ اور مبتذل نہ ہونے دینا بہت بڑی بات ہے۔

خلیل کی صناعی یہ ہے کہ کلام میں شستگی اور بے کیفی نام کو نہیں۔ لفظی اغلاق اور معنوی پیچیدگیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ مشکل قوافی کو اس برجستگی سے باندھا ہے کہ

---

[1] امیر احمد علوی۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت۔ نگار جولائی ۱۹۶۱ ص ۲۴۔

آورد کا ذرا گمان نہیں ہوتا۔ انداز بیان کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے جائیے کہیں گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ مختلف عنوانات کے تحت "بتخانۂ خلیل" کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

سہل ممتنع:

تمہارے بغیر اب گزرتی نہیں — جو دن کٹ گیا شب گزرتی نہیں
نہ کھانے نہ پینے نہ سونے سے کام — اگر ہے تو چھپ چھپ کے رونے سے کام

—

ادھر تو وہ ٹوٹا روانہ ہوا — اُدھر دردِ سر کا بہانہ ہوا

—

جُدائی سے صدمے سہوں کس طرح — مسہری پہ تنہا رہوں کس طرح
کٹیں کس طرح زندگانی کے دن — جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

—

بدن جا بجا سے چرائے ہوئے — نمودار چیزیں چھپائے ہوئے

—

ہر اک سمت یادل برستا رہا — مگر کھیت میرا ترستا رہا

—

الگ چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں — ادھر پھینک دیں کچھ ادھر پھینک دیں

—

عجب حسن پایا ہے اس ماہ نے — بنایا ہے آپ اس کو اللہ نے
یہ جی چاہتا ہے کہ دیکھا کرے — کرے تو اسی بت کو سجدا کرے

—

عام بول چال کی زبان :

سنو تو یہ مجھکو بلاتی ہے کون — یہ چوڑی بجی کسکی آتی ہے کون
اُسے ڈر سے تکتی تو لگی ہے کوئی — ہٹو جلد وہ دیکھتی ہے کوئی

مری شکل و صورت تو اچھی نہیں — اجی جھوٹ ہے سچ یہ کچھ بھی نہیں
تمہیں کہنے سننے میں جانا نہ تھا — پر بندے کی باتوں میں آنا نہ تھا

نہیں سوجھتا کچھ کدھر جاؤں میں — یہ جی میں ہے کچھ کھا کے مرجاؤں میں

وہ بولی کہ چل ہٹ سرک دُور ہو — زیادہ نہ بیہودہ بک، دُور ہو

چلی جب ذرا چال وہ چل گئی — کہ دل اپنے تلووں سے مل دل گئی

مرے دل کا داغ اب یہ جگنو بھی ہے — مرے ٹھینگے پہ آرسی تو بھی ہے

منہ آئینے میں دیکھا بھالا گیا — دوپٹہ وہ سر پر سنبھالا گیا

بتائیں تو سرکار ہے بات کیا — یہ کیوں ست گیا منہ ہوئی بات کیا

روزمرہ اور محاورے :

جو نام خدا پنج سالہ ہوئی — تو آفت وہ رشک غزالہ ہوئی

نظر جس پہ کی ناچ سے تھیا اسے — دیا جسکو پانی ڈبویا اُسے

یہ کیا ہو گیا تجھکو اک آن میں — دیا پھونک تو تے نے کیا کان میں

شب غم کی کچھ انتہا ہی نہیں — پلک سے پلک آشنا ہی نہیں

ہوا دن سے راتوں کو رونے لگی — سحر آنکھوں آنکھوں میں ہونے لگی

پھرا مجھ سے تو کیا جہاں پھر گیا — زمیں پھر گئی آسماں پھر گیا

وہ آتی ہے چھا جوں برستی ہوئی — نہ کیوں اب تلک مے برستی ہوئی

اداؤں پہ گل جان دینے لگے — قدم فتنے اٹھ اٹھ کے لینے لگے

ہوا شاق تو تے کا رہنا اسے — ہوا زہر اسکا یہ کہنا اُسے

یہ سنکر ہوئی اور مغرور وہ — ہوئی نشۂ حسن سے چور وہ

تشبیہیں اور استعارے :

ہوا سے جھکیں شاخیں جھکی اسطرح — جھکائے دلہن ہو نظر جس طرح

صراحی سے ساغر جدا ہو گیا — چمن سے گل تر جدا ہو گیا

اکیلی بھری انجمن میں رہی — پریشاں ہمیشہ چمن میں [illegible]

ہوا بھیگنے سے بدن اسطرح — کوئی پھول شبنم سے تر جسطرح

گزر کیسے دل میں بتوں کا نہ تھا — جو گھر تھا وہ آذر کا بتخانہ تھا

نہا کر گھنے بال پھیلا دیئے — جفا کار نے جال پھیلا دیئے

نظر آنکھ میں آرزو دل میں ہے — چمن میں ہے گل شمع محفل میں ہے

وہ مانگ اسکی ہے راہ ظلمات کی — جبیں چاندنی چودھویں رات کی

قوافی کا فنکارانہ استعمال :

عجب نور تھا جسم شفاف پر — پھسلتا تھا پانی تن صاف پر

ہر اک کے بدن کا لہو گھٹ گیا — دلوں کیطرح بادباں پھٹ گیا

موافق ہمیشہ مقدر رہے — ہما سر پہ کھولے ہوئے پر رہے

ہوا شک جہاں بوے کاکل گئی — کہ شیشی کوئی عطر کی کھل گئی

قیامت کی اس بحر کی لہر ہے — جو قطرہ ہے وہ سانپ کا زہر ہے

یہ کہتے ہیں جتنے ہیں اس دیس میں — پری ہے یہ انسان کے بھیس میں

صراحی ملے آج وہ نور کی — بنی جس پہ ہو بیل انگور کی

چمکتی ہوئی سیم سے بھی سوا — دلاویز تسنیم سے بھی سوا

کھڑی تھی کوئی بال کھولے ہوئے — نگاہوں کی شمشیر تولے ہوئے

نازک خیالیاں :

فلک حسن پر اپنے مغرور ہے — جو تارہ ہے خال رخ حور ہے

بیاں کیا کروں رنگ کا روپ کا — گماں تن کے سایے پہ تھا دھوپ کا

جو پانی پڑا اور بھیگا بدن — چھپا ساریوں میں نہ ان کا بدن
لپٹ کر وہ جلد بدن ہو گئیں — برہنہ وہ سب سیم تن ہو گئیں
کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی — تو عکس بدن سے گہر ہو گئی

مقابل اگر اسکے یہ باغ ہو — تو لالہ سا ہر پھول میں داغ ہو

الگ اس سے کیوں آ پا آتا ہوا — نہ کیوں اسکے انگیا کی جڑا ہوا

جگر خشک ہوتے تھے لب کی طرح — سیہ فام دن بھی تھا شب کی طرح
جو غنچہ تھا شاک اس پہ تھا خار کا — جو پتا تھا چہرہ تھا بیمار کا
تپش سے تھے چھالے جگر میں پڑے — پھپھولے تھے پاسے نظر [illegible]

بتخانۂ خلیل میں زبان و بیان کی خامیوں کی تلاش بے سود ہے۔ ہمیں بھی تو خال خال مثلاً چند ایک مقامات پر ایطائے خفی کا نقص نظر آتا ہے۔
جیسے کمر بال سی، سینہ نکلا ہوا جوانی سے دن حسن اُبلا ہوا

نظر سے ہے جی پر بنی اور بھی بھری آنکھیں ہے موہنی اور بھی

اداسی برسنے لگی شہر میں بسی آکے افسردگی شہر میں

کہا اُس نے بیشک ہے اچھی تو ہو رسیلی بھی ہو بانکی ترچھی تو ہو

صاف ستھری مثنوی میں ذیل کے الفاظ کا استعمال سماعت پر گراں گزرتا ہے۔

شرارت وہ اف شاطرونکی غضب وہ چھپ تختیاں کا زونکی غضب

کڑھا انکی فرقت پہ درویش بھی ہوا مضطرب وہ صفاکیش بھی

قیامت کا سونا حسینوں کا ہے ستم اینڈنا نازنینوں کا ہے

وہ گٹھے بندھن انکا مزہ دے گیا یہ وقت اور لوگوں کا دل لے گیا

سڑن سی وہ بیچاریاں ہو گئیں غم و رنج سے نیم جاں ہو گئیں

وہ چتون بھویں تیغ سے کم نہیں   انھیں اپنے مقتول کا غم نہیں

مثنوی کے خاتمہ کا بیان سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہر اک شعر درد و غم کا مرقع ہے یہ کلائمکس بڑا درد انگیز ہے۔

صراحی سے ساغر جدا ہو گیا   چمن سے گل تر جدا ہو گیا
وہ اس کی حسین رانیاں چھٹ گئیں   وہ گلفام گل پیرہن لٹ گئیں
نہ جینا مگر پھر خوش آیا انھیں   وہ گھل گھل کے مرنا نہ بھایا انھیں
وہ جی کھونے کو مستعد ہو گئیں   ستی ہونے کو مستعد ہو گئیں
عزیزوں نے ہر چند روکا انہیں   دیا ساتھ سب نے دلاسا انھیں
مگر باز آئیں نہ زنہار وہ   ہوئیں حسب دستور تیار وہ
اسے لیکے دونوں ستی ہو گئیں   وہ پیاری حسین مورتیں کھو گئیں

نہ راجا رہا اور نہ رانی رہی
فقط ایک ان کی کہانی رہی

آغاز داستان میں خلیل حسن خلیل نے اپنی مثنوی کے اسلوب اور طرز نگارش کے تعلق سے جس تمنا کا اظہار کیا ہے اسے حرف بہ حرف پورا کر کے دکھایا ہے۔ یہ اشعار خلاصہ میں اس مثنوی نگاری کے منصوبہ کا جو انھوں نے تیار کیا تھا۔

الگ سب سے انداز ہو   جو مصرع ہو افسوں ہو اعجاز ہو
کبھی رنگ کوئی نہ پائے مرا   مزہ روزمرہ دکھائے مرا
بھرا ہو نہ اک دم اثر لفظ سے   ٹپکتا رہے رنگ ہر لفظ سے
سب الفاظ سانچے میں ڈھلتے رہیں   اچھوتے مضامیں نکلتے رہیں
وہ بندش ہو چھوٹے بڑے دم بھریں   ہم لوگ جس طرح باتیں کریں

جو مضموں ہو سادہ ہو مالی نہ ہو   مزے سے کوئی شعر خالی نہ ہو
صفائی سے خوش اہلِ انصاف ہوں   اشارے کنایے بہت صاف ہوں
دکھائے مزے یہ روانی مری   فسانہ ہو ہر سو کہانی مری

نہ رہ جائے قصہ ادھورا مرا
الٰہی یہ ارماں ہو پورا مرا

ارمانِ خلیلؔ اس حد تک تو پورا ہوا کہ انھوں نے مثنوی کی تکمیل کی اور ان کے حین حیات اس کی اشاعت بھی عمل میں آئی لیکن ان کا یہ ارمان بر نہ آیا کہ

فسانہ ہو ہر سو کہانی مری

بات دراصل یہ ہے کہ یہ مثنوی طبع تو کانپور میں ہوئی لیکن ایک ایسے مقام ریاست بلرام پور (گونڈہ) سے شائع ہوئی جو اردو کا کوئی ادبی مرکز نہ تھا اس میں جناب خلیلؔ کی گوشہ نشینی کو بھی دخل ہے کہ وہ بلرام پور کی ریاست کے دربار سے منسلک ہوئے تو پھر وہاں سے باہر نہ نکلے اور وہیں وفات پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مثنوی نہ تو ادبی دنیا کی نظر میں آئی اور نہ اسے قبول عام ملا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پنجۂ نگاریں (تبخانۂ خلیلؔ) اردو کی افسوسناک حد تک بھولی ہوئی مثنویوں میں سے ایک ہے۔ مصنف کے نام سے متاثر ہونے والوں نے اس شاعر کے خونِ جگر کی یہ قدر کی کہ آج اس کام کو بھی کوئی نہیں جانتا۔" [۱]

اگر یہ سمجھا جائے کہ مثنوی نگاری کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے تسلسل بیان الفاظ کی بندش، مصرعوں کی روانی، الفاظ کی دلکشی اور قوت اظہار سے

---

[۱] ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ اردو مثنوی کا ارتقا ۱۹۶۵ء ص ۴۲۶

لگایا جاتا ہے تو تبخانۂ خلیل اس کسوٹی پر پوری طرح اترتی ہے۔

یہ بات میرے لیے باعث تسکین ہے کہ اس بھولی ہوئی مثنوی کو سیر حاصل تبصرہ کے ساتھ منظر عام پر لا رہا ہوں۔ اب یہ کام مثنوی کے ارتقا کا جائزہ لینے والوں کا ہے کہ وہ اس کی قدر و قیمت کا تعین کریں۔

کتابیات

امیر احمد علوی ملک محمد جائسی کی پدماوت نگار جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

" اردو کی مثنویاں نگار اصناف نمبر سنہ ۱۹۶۷ء

پرکاش مونس (ڈاکٹر) - پدماوت - ہماری زبان اپریل سنہ ۱۹۷۲ء

جائسی - پدماوت - (فارسی رسم خط) - نولکشور لکھنؤ

" پدماوت - (ہندی رسم خط) - سنہ ۱۹۲۰ء

حبیب احمد صدیقی - اردو کی شرمناک مثنوی نگار سنہ ۱۹۶۲ء

دلدار حسین - اردو پدماوت آجکل - مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

رامچندر شکلا - جائسی گرنتھاولی

سید کلب مصطفیٰ ملک محمد جائسی سنہ ۱۹۴۱ء

سید محمد عقیل ڈاکٹر اردو مثنوی کا ارتقا سنہ ۱۹۶۵ء

شیخ احمد علی پدماوت (بخط فارسی) سنہ ۱۸۶۱ء

عبرت و عشرت شمع و پروانہ سنہ ۱۷۸۶ء

فرمان فتحپوری اردو کی منظوم داستانیں سنہ ۱۹۷۱ء

قاسم علی بریلوی - پدماوت - سنہ ۱۸۷۱ء

گیان چند جین (پروفیسر) - پدماوت - اردو نظم میں رسالہ اردو ۱۹۵۱ء

میر حسن دہلوی - سحر البیان

نسیم - گلزار نسیم

نصیر الدین ہاشمی یورپ میں دکنی مخطوطات

قطعہ تاریخ

طبع ثانی مثنوی بتخانۂ خلیل ترجمہ پدماوت جائسی

دیکھا اے دیدہ ور شائع ہوئی
مثنوی پراثر شائع ہوئی

سیکڑوں دشواریاں اس راہ میں
پیش تو آئیں مگر شائع ہوئی

یہ علی احمد جلیلی کا ہے ذوق
پھر بشکل معتبر شائع ہوئی

دیدۂ بینا سے اس کو دیکھئے
حاصلِ اہلِ نظر شائع ہوئی

متقیؔ سال اک برآمد یہ ہوا
مثنوی بارِ دگر شائع ہوئی

۱۴۱۴ ھ

ڈاکٹر سید عباس متقی

ہوالمستعان

پہلی مثنوی

جناب حافظ خلیل حسن صاحب المتخلص بہ خلیل

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علیخان صوفی طبع شد

سنہ ۱۳۳۲ھ مطابق سنہ ۱۹۱۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

جو چاہا لکھوں حمد اُٹھا کر قلم
گرا ہاتھ سے تھرتھرا کر قلم

سمائی یہ دہشت جگر پھٹ گیا
اٹھائی وہ خفت کہ کٹ کٹ گیا

ثنا اس کی کوئی کرے کیا مجال
کوئی حمد کا دم بھرے کیا مجال

یہ تعریف ہے اختیاری کہاں
کہاں آدمی، حمد باری کہاں

یہاں پاؤں امکان کا لنگ ہے
فرشتوں کا بھی حوصلہ تنگ ہے

طرازندۂ جزو و کل ہے وہی
نگارندۂ خار و گُل ہے وہی

اسی نے حسینوں کو صورت یہ دی
صباحت یہ دی اور نزاکت یہ دی

اسی نے یہ عاشق کو پیدا کیا
اور ان کو حسینوں پہ شیدا کیا

وہی اک ہر آئینہ خانے میں ہے
اسی کی تجلّی زمانے میں ہے

جمائے ہے رنگ اپنا ہر سو وہی
وہی رنگ پھولوں کا ہے بو وہی

کہیں ہے فروغِ سویدائے دل
کہیں حسرتِ دل تمنائے دل

کہیں رنگ فریاد بلبل ہوا
کہیں غازۂ چہرۂ گُل ہوا

غرض تیری یارب عجب ذات ہے
انوکھی ہے جتنی تری بات ہے

یگانہ ہے بینا ہے دانا ہے تو
زبردست ہے تو توانا ہے تو

گزر دل میں آنکھوں پہر ہے ترا
رگ جاں سے نزدیک گھر ہے ترا

ہمیشہ سے بخشش تری عام ہے
خبر سب کی لینا ترا کام ہے

نعت

پلا ساقیا جام کوثر مجھے
کہ در پیش ہے نعت گوئی مجھے

مئے نعت سے مجھکو مخمور کر
مجھے خوب نشے سے تو چور کر

وہ دِل میں ہو جوش وِلائے نبیؐ
بنوں میفروش ثنائے نبیؐ

نبیؐ کون یعنی حبیب خُدا
ہمارے حضور احمدؐ مصطفےٰ

نسیم دلاویز گلزار دیں
خداوندا ایمان و سردار دیں

فِدائے خدا جاں نثار خُدا
امین خُدا راز دار خُدا

کوئی ان سے رُتبے میں بہتر نہیں
کِسی کو یہ عزت میسر نہیں

نہ تھے جس سے واقف بتایا ہمیں
جو رستا تھا سیدھا دِکھایا ہمیں

ہماری شفاعت کے ضامن ہوئے
بنے سب کے شافع معاون ہوئے

ہدایت بھی کی اور شفقت بھی کی
غم و رنج میں سب کے شِرکت بھی کی

خبر سب کی ہر وقت لیتے رہے
بُرے وقت میں ساتھ دیتے رہے

مناجات

الٰہی وہ بیتاب دے دل مجھے — جو رکھے شب و روز بسمل مجھے

نہ مرہم سے افسردہ ہوں داغِ دل — ہمیشہ شگفتہ رہے باغِ دل

محبت مرے دم کی ہمدم رہے — جگر میں تاسف رہے غم رہے

نہ دل سے مرے عشق ہو کم ترا — رہے جب تلک دم بھر دل دم ترا

رہوں زیر داماں کہسار عشق! — مجھے سر اٹھانے نہ دے بار عشق

توحش مرا ہوش اڑائے مرے — مری بے پری پر لگائے مرے

نہ کم زندگی بھر مرا جوش ہو — طبیعت میں ہر دم نیا جوش ہو

اسی جوش میں اک فسانہ لکھوں — کوئی مثنوی عاشقانہ لکھوں

لکھوں کچھ رتن سین مضطر کا حال — لکھوں پدمنی حور پیکر کا حال

نیا گرچہ کوئی یہ قصہ نہیں — مرا خاص کوئی یہ حصہ نہیں

ملک یہ فسانہ بیاں کر چکا — وہ بھاکے میں اس کو عیاں کر چکا

جو کچھ بچ گیا اس سے اور رہ گیا — تو اردو میں عبرت اسے کہہ گیا

مگر ہے مری کبھی تمنا یہی — بھرا ہے مرے سر میں سودا یہی

تو یارب وہ دے تو طلاقت مجھے — کہ ہو ہم فنوں میں نہ خجلت مجھے

رکاوٹ طبیعت کی کھو دے مری — زباں آب کوثر سے دھو دے مری

الگ ہی مرا سب سے انداز ہو — ہر مصرع ہو افسوں ہو اعجاز ہو

سمجھی رنگ کوئی نہ پائے مرا — مزہ روز مرہ دکھائے مرا

جُدا ہو نہ اک دم اثر لفظ سے ٹپکتا رہے رنگ ہر لفظ سے
سب الفاظ سانچے میں ڈھلتے رہیں اچھوتے مضامین نکلتے رہیں
وہ بندش ہو چھوٹے بڑے دم بھریں بہم جس طرح لوگ باتیں کریں
جو مضموں ہو سادہ ہو عالی نہ ہو مزے سے کوئی شعر خالی نہ ہو
صفائی سے خوش اہل اِنصاف ہوں اشارے کنایے بہت صاف ہوں
دِکھائے مزے خوش بیانی مری فسانہ ہو ہر سو کہانی مری
نہ رہ جائے قصّہ ادھورا مرا
الٰہی یہ ارماں ہو پورا مرا

مدح عالی جناب معلی القاب خداوند نعمت جناب سر مہاراجہ بھگوتی پرساد سنگھ صاحب بہادر والی ریاست بلرام پور دام اقبالہم وحشمتہم

وہ مے ساقی یار جانی پلا وہ جام مئے ارغوانی پلا
کہ بڑھ جائے ہاتھوں طبیعت مری نکل جائے سب دل کی حسرت مری
کروں مدح میں اپنے آقا کی کچھ ستائش کروں قدر فرما کی کچھ
وہ نوخیز شمشاد باغِ مُراد وہ ہر دل کے گھر کے چراغِ مراد
وہ سرمایۂ افتخار اودھ وہ رونق فزائے دیار اودھ
وہ سردار و سرتاج بلرام پور جناب مہاراج بلرام پور
جہاں نام سے ان کے آباد ہے ملا بھگوتی اور پرشاد ہے
خدا نے وہ توقیر دی ہے انھیں وہ قسمت وہ تقدیر دی ہے انھیں
کہ آج ان کے کوئی برابر نہیں کوئی ان کا ثانی و ہمسر نہیں
ذہانت ہے رُخ سے عیاں اسطرح عیاں جوہر آئینہ سے جس طرح

یہی حال ہے شان و اجلال کا ستارہ چمکتا ہے اقبال کا
عدالت سے آٹھوں پہر کام ہے بھرا رحم و شفقت سے ہر کام ہے
کوئی عدل سے بات باہر نہیں صعوبت اذیت کسی پر نہیں
بڑا نام پایا ہے اخلاق میں بہت ہیں وہ مشہور آفاق میں
ترحم کی یکساں نظر سب پہ ہے تلطف کا پورا اثر سب پہ ہے
غرض رحم سے مہربانی سے کام ہنر پروری قدر دانی سے کام
بڑا سب سے حصہ میں آیا ہے دل سخاوت میں حاتم کا پایا ہے دل
غریبوں فقیروں کا گھر بھر دیا جو قطرہ تھا دریا اُسے کر دیا
مُلازم بھی راضی رعایا بھی ہے خوش اپنا بھی ہے اور پرایا بھی ہے
انھیں شاد رکھے خدائے کریم رہے چشم بد سے بچائے کریم
کرے مرحمت خضر کی عمر انھیں ملے اس جہاں میں بڑی عمر انھیں

موافق ہمیشہ مقدر رہے
ہما سر پہ کھولے ہوئے پر رہے

آغاز داستان

مئے ناب سے جام بھر ساقیا مجھے بھی مُرید آج کر ساقیا
بہت تو نے وعدوں پہ ٹالا مجھے پلا آج اپنا پیالا مجھے
کروں جس میں دل سے اطاعت تری ملی ہے نصیبوں سے خدمت تری
بنا تو بھی پورا شرابی مجھے چھلکتی ہوئی دے گلابی مجھے
یہ غم جس سے میرا فراموش ہو طبیعت بڑھے دل کو اک جوش ہو
فسانہ جو بھاکے کا مشہور ہے یہ حال اس میں اس طرح مذکور ہے
کہ تھا ایک راجہ سراندیپ میں نرالا تھا اخلاق و تہذیب میں
امارت ریاست لیاقت میں فرد جو سیرت میں یکتا تو صورت میں فرد

سوا نامور جم فریدوں سے بھی — خزانہ بڑا گنج قاروں سے بھی

اور اس سے بڑا اس نے پایا تھا دل — سمندر تھا آپ اور دریا تھا دل

سخاوت میں حاتم زمانے کا تھا — بڑا شوق دینے دلانے کا تھا

خزانے سے اِتنی محبّت نہ تھی — لٹانے سے ہاتھوں کو فرصت نہ تھی

دیا جس کو خوب اس کا جی بھر دیا — ہمیشہ کو اس کو غنی کر دیا

غرض وہ بڑے لُطف کا دَور تھا — جفا تھی کسی پہ نہ کچھ جور تھا

شب و روز راحت سے رہتے تھے سب — اسے گندھرپ سین کہتے تھے سب

ذہین و خرد مند و ہشیار تھا — جہاندیدہ تھا تجربہ کار تھا

مگر غم سے راجہ کا دل چاک تھا — نگاہوں میں اس کی یہ سب خاک تھا

وہ شاکی تھا قسمت کی بیداد کا — کلیجے پہ تھا داغ اولاد کا

کوئی نام رکھ لینے والا نہ تھا — کوئی اس کے گھر کا اُجالا نہ تھا

یہ صدمہ تھا نشتر جگر کے لیے — تڑپتا تھا نور نظر کے لیے

دُعا حق سے تھی دل کو راحت مِلے — اب آنکھوں کو میری بصارت مِلے

قبول اس کی بارے دُعا ہو گئی — تڑپ دل کی دل کی دوا ہو گئی

ہوئی حاملہ اس کی رانی بڑی — محل میں ہوئی شادمانی بڑی

ہوا سب کو اس بات کا اِنتظار — کہ لائے گھڑی جلد وہ کردگار

غرض سب مہینے گئے جب گزر — اور اس روز کی ہنستی آئی سحر

تو پیدا ہوئی اک حسین جہاں — صبیح جہاں، نازنین جہاں

عجب صاحب حسن پیدا ہوئی — پری شیفتہ، حور شیدا ہوئی

مقابل ہو طاقت نہ تھی حور کی — سراپا وہ تصویر تھی نور کی

خجل اس سے سب حُسن والے ہوئے — جو اعضا تھے سانچے میں ڈھالے ہوئے

بہت خوش اُسے پا کے راجا ہوا — سوا حد سے دل شاد اس کا ہوا

کیا غم نہ اس کا جو دختر ہوئی — خوشی اس کو لڑکے سے بڑھ کر ہوئی

فقیروں کو اس دن دلایا بہت　　زر و لعل و گوہر لُٹایا بہت

گدا دامن و جیب بھر لے گئے　　دُعا دے گئے لعل و زر لے گئے

لگے کہنے پدماوت اس بُت کو سب　　لگی روز و شب بڑھنے وہ غنچہ لب

ہوئے باپ ماں اس پہ جی سے نثار　　لگے شکر ادا کرنے وہ بار بار

بڑے ناز و نعمت سے پالا اُسے　　محل سے نہ باہر نِکالا اُسے

جو نام خُدا پنج سالہ ہوئی　　تو آفت وہ لا رشکِ غزالہ ہوئی

گئے جتنے بھونرے تھے سب گل کو بھول　　یہ سمجھے کہ کوئی کنول کا ہے پھول

اسی پھول کے آگے پھرنا انھیں　　اسی شمع پر آ کے گرنا انھیں

خجالت سے سب پھول مرجھا گئے　　فلک پر مہ و مہر شرما گئے

بہت تربیت دل سے اس کی ہوئی　　بڑی اس کی تعلیم اچھی ہوئی

خواصیں بھی تھیں اس کی سب ہوشیار　　بہت خوش تمیز اور ذہانت شعار

پسند اس نے کوٹھے پہ رہنا کیا　　دُلہن کی طرح اس کا کمرہ سجا

وہ توتا اک اچھا تھی پالے ہوئے　　زمانہ تھا وہ دیکھے بھالے ہوئے

زبان پر تھی اس کے کہانی نئی　　وہ کرتا سدا گلفشانی نئی

فدا اس پہ وہ غیرتِ ماہ تھی　　بڑی قدر اس کی بڑی چاہ تھی

کہیں وہ بغیر اس کے جاتی نہ تھی　　قفس سامنے سے ہٹاتی نہ تھی

وہ توتا بھی اس حور پر لوٹ تھا　　اداؤں کی کھائے ہوئے چوٹ تھا

پھنسائے تھے گیسو نے اسکو بھی جال　　نظر کر گئی تھی اُسے بھی حلال

قرار اس کو بے اسکے آتا نہ تھا　　وہ ہٹتی تو کچھ اس کو بھاتا نہ تھا

نہ کھاتا تھا وہ اور نہ پیتا تھا وہ　　اسی حور کو دیکھ جیتا تھا وہ

یہی اس کی الفت میں ہر روز حال　　یہی رات دن اسکے دل میں خیال

الگ اس سے کیوں ہائے اِتنا ہوا　　نہ کیوں اس کی انگیا کی چڑیا ہوا

ہرے پر تو کم بخت میرے ہوئے　　نہ فیروزے خاتم کے اسکے ہوئے

کوئی پر ہوا لال تو کیا ہوا
نہ یاقوت تو تو نگے کا ہوا

اسی طرح اک روز گھبرا کے وہ
یہ کہتا تھا تنہا اُسے پا کے وہ

کہ بے تیرے آرام مجکو نہیں
مرا حال معلوم تجکو نہیں

ستم کر گئے ہیں کرشمے ترے
گئے ہیں اُتر دل میں عشوے ترے

یہی چاہتی ہے محبّت تری
کہ دیکھا کروں بیٹھے صورت تری

کہیں چھوڑ کر مجکو جایا نہ کر
بہت دیر تک منہ چھُپایا نہ کر

یہ کلمے محبّت کے اظہار کے
پڑے کان میں اک پرستار کے

گلہ جاکے رانی سے اس کا کیا
ڈھٹائی کا شوخی کا شکوا کیا

ہوئی سُنکے توتے سے رانی اُداس
لگی کہنے اس بُت کو بلوا کے پاس

کہ بیٹی یہ توتا تو اچھا نہیں
پسند اس کا ہم کو تو لہجا نہیں

اسے اپنی صحبت سے کر دو جُدا
منگا لو کوئی اور تم دوسرا

سُنا یہ تو اس کے نکل آئے اشک
کچھ آنکھوں سے گالوں پہ ڈھل آئے اشک

گئی وہ سمجھ کچھ کسی نے کہا
حسد سے کہا دُشمنی سے کہا

کہا اس نے توتا یہ انساں نہیں
زیادہ کوئی اس سے ناداں نہیں

نہیں حال معلوم یاں تک اُسے
مرے لب پہ پستے کا ہے شک اسے

اسے میرے گالوں پہ شک گُل کا ہے
گماں زلف پر خم پہ سنبل کا ہے

گماں ہے کہ غنچہ دہن ہے مرا
کوئی سیب تازہ ذقن ہے مرا

بُرا ہائے اس کو بتاتا ہے کون
اسے مجھ سے ناحق چھُڑاتا ہے کون

مرا تو یہی ایک غمخوار ہے
مرا ہر گھڑی یہ مددگار ہے

یہ سنکر وہ سب اسکا شک مٹ گیا
وہ چُپ ہو گئی پھر نہ اس سے کہا

مگر دل میں توتا ہراساں ہوا
وہ اس گفتگو سے پریشاں ہوا

کہا اس سے اب یاں ہے ڈر جان کا
خطر جان کا ہے ضرر جان کا

مرا غم نہ اب اے پری زاد کر
مجھے چھوڑ دے غم سے آزاد کر

کہا اس نے سوجھی ہے یہ کیا تجھے
جنوں ہو گیا ہے کہ سودا تجھے
حفاظت تری تو مرے ہاتھ ہے
نہ ڈر تو مری جان کے ساتھ ہے
بھلا تجھکو دے گا اذیت کوئی
کہاں سے یہ لائے گا جرأت کوئی

پدماوت کا باغ کی سیر کو جانا اور خادمہ کا توتے کو کوئیں میں ڈال دینا

بہار آئی ساقی گلستاں میں پھر
بھرے پھول گلچیں نے داماں میں پھر
معطر ہوائیں پھر آنے لگیں
مہک پھر وہ پھولوں کی لانے لگیں
مگر ہائے تجھکو خبر کچھ نہیں
مری اس تڑپ پر نظر کچھ نہیں
اٹھی دیکھ وہ کالی کالی گھٹا
کلیجے پہ وہ چھانے والی گھٹا
وہ آتی ہے چھاجوں برستی ہوئی
نہ کیوں اب تلک ہے برستی ہوئی
نظر اس طرف کیوں یہ مڑتی نہیں
پری ہے تو کیوں بوتل اڑتی نہیں
اسی وقت تو لطف پینے کا ہے
نہیں تو مزہ کون جینے کا ہے
پلا دے ہمیں تو بھی جی بھر کے آج
چلیں دور پر دور ساغر کے آج
صراحی ملے آج وہ نور کی
بنی جس پہ ہو بیل انگور کی
کروں سیر نشے میں گلزار کی
نکالوں تمنا دلِ زار کی
وہ اس گل کے ہمراہ ہمجولیاں
وہ ہر دم کی دمساز شیریں زباں
لگیں کرنے اک دن ثنائے چمن
کہ ہے حد سے دلکش فضائے چمن
سنا ہے کہ پھولی ہے جوہی بہت
کھلی ہر طرف ہے چنبیلی بہت
نکھاروں پہ ہیں شاہدانِ چمن
جو گل ہے چمن میں ہے جانِ چمن
جدا سب سے ہے نسترن کی بہار
نئی ہے گلاب و سمن کی بہار
اثر لوں ہے پھولوں کی بو باس میں
رچی عطر کی بو ہے ہر گھاس میں

وہ دن ہیں کہ ہیں لوٹ گلشن پہ سب
تصدق ہیں نرگس پہ سوسن پہ سب

خصوصاً جو ہے باغ سرکار کا
وہ ہے فخر ہر ایک گلزار کا

گلوں سے بھرا ہے چمن ہر جگہ
کھلے ہیں گلاب و سمن ہر جگہ

کریں گی نہ سیر اب کے سرکار کیا
رہے گا ترستا ہی گلزار کیا

ہوئی سنکے مشتاق وہ گلبدن
کہا کل کروں گی میں سیر چمن

معاً پاس ماں کے وہ اٹھ کر گئی
بہت بیقرار اور مضطر گئی

کہا حکم اگر آپ کا پاؤں میں
تو کل سیر گلزار کو جاؤں میں

ذرا دل کو پھولوں سے بہلاؤں گی
سر شام پھر گھر چلی آؤں گی

کہا ماں نے کب میں نے روکا تمہیں
چلیں کب چمن کو کہ ٹوکا تمہیں

مبارک تمہیں ہو گلستاں کی سیر
کرو تم خیاباں خیاباں کی سیر

یہ سنکر وہ غنچہ دہن کھل گئی
کہ ہاں اب اجازت ہمیں مل گئی

ہوئیں اس کی ہمجولیاں شادماں
لگیں اب وہ سب کرنے تیاریاں

رتھیں بہلیں سب دیکھی بھالی گئیں
ضرورت کی چیزیں نکالی گئیں

وہ دن تو کٹا کٹ سکا جس طرح
مگر رات ہو اب بسر کس طرح

وہ رات ان کو کالی بلا ہو گئی
شب ہجر سے بھی سوا ہو گئی

سرکتی نہ تھی کاٹے کٹتی نہ تھی
سیاہی وہ آگے سے ہٹتی نہ تھی

لگیں مانگنے سب دعائے سحر
کہ گزرے یہ شب اور آئے سحر

نگاہیں جمیں سب کی سوئے فلک
سب اٹھ اٹھ کے تکتی تھیں روئے فلک

نہ جھپکی کسی ماہ پیکر کی آنکھ
کھلی رہ گئی جیسے اختر کی آنکھ

سوئے شرق سب کی نظر بار بار
یہ ان کے لب لعل پر بار بار

الٰہی یہ نوبت بجی کیوں نہیں
ابھی تک اٹھا نوبتی کیوں نہیں

پڑے چپ ہیں مرغ سحر کس لیے
نہیں آج بجتا گجر کس لیے

ہوا بارے کچھ کچھ ظہور سحر
لگا پھیلنے بڑھ کے نور سحر

سیاہی لگا ہونے پنہاں ہوئی — سحر کی سپیدی نمایاں ہوئی

ستارے ادھر منہ چھپانے لگے — چراغ اس طرف جھلملانے لگے

نسیم سحر ناز دکھلا چلی — خراماں خراماں وہ پھر آ چلی

درختوں کی شاخیں لچکنے لگیں — کھلیں ساری کلیاں مہکنے لگیں

بسیروں میں چڑیاں بھی گانے لگیں — سہانی صدائیں سنانے لگیں

ہٹی بارے رخ سے نقاب سحر — چمکنے لگا آفتاب سحر

بہت ہی ہوئی وہ پری زاد شاد — اٹھی بستر ناز سے شاد شاد

وہ ہمجولیاں سب فراہم ہوئیں — وہ پھر اک جگہ جمع باہم ہوئیں

کوئی اپنا منہ ہاتھ دھونے لگی — کوئی نتھ میں موتی پرونے لگی

کوئی اپنا جوڑا بدلنے لگی — کوئی عطر کپڑوں میں ملنے لگی

جمانے لگی لب پہ لاکھا کوئی — لگی چننے اپنا دوپٹا کوئی

مگر قہر جو پدمنی نے کیا — نہ ان گلرخوں میں کسی نے کیا

کیا اس نے اس دن نکھر کر ستم — جفا پر جفا اور ستم پر ستم

پری ہی وہ نازک بدن بن گئی — دلہن ہی وہ گل پیرہن بن گئی

اٹھایا کہاروں نے سکھپال کو — چلے لیکے اس برق تمثال کو

رتھیں بہلیں بھی سب برابر چلیں — سب اس کے خواصوں کو لیکر چلیں

کہیں اب نہ وہ گھر سے چلکر رکیں — پہنچ کر در باغ ہی پر رکیں

وہ گلپوش اتری جھمکڑے کیساتھ — بڑی شان و شوکت کرشمے کے ساتھ

چلی اس ادا سے وہ سوئے چمن — بڑھی پیشوائی کو بوئے چمن

اداؤں پہ گل جان دینے لگے — قدم فتنے اٹھ اٹھ کے لینے لگے

ٹھہرتی ٹہلتی چمکتی چلی — کمر ہر قدم پر لچکتی چلی

دوپٹے کا آنچل لٹکتا چلا — وہ گوٹا سنہرا جھلکتا چلا

وہ دھانی دوپٹہ وہ لچکے کی گوٹ — ستم ڈھا رہی ہے پراتے کی گوٹ

جفا ساتھ شوخی ادا ساتھ ساتھ — کرشمہ نزاکت حیا ساتھ ساتھ
دل باغ کو داغ دیتی ہوئی — گل و غنچہ کی جان لیتی ہوئی
میان گلستاں وہ داخل ہوئی — جو دل کی تمنّا تھی حاصل ہوئی
رُخِ گُل پہ افسردگی چھا گئی — کلی جو کھلی تھی وہ مُرجھا گئی
اُڑا رنگ ہر گل سے بو کیطرح — ندامت سے سمٹے لجا لو کیطرح
کوئی گل نہ تھا جو پشیماں نہ تھا — سلامت کسی کا گریباں نہ تھا
لگیں سیر کرنے وہ ہر ہر طرف — چمک کر ہوئیں جلوہ گر ہر طرف
چمکتی تھیں ہر سو ستارے کی طرح — نہ چین ان کو دم بھر تھا پارے کیطرح
گئیں شوخیوں سے نہ وہ کسطرف — کبھی اِسطرف تھیں کبھی اُسطرف
وہ گلزار بھی معدن نور تھا — تجلی وہ گلشن طور تھا
کہیں ارغواں تھا، چنبیلی کہیں — مہکتی تھی جوہی اکیلی کہیں
کہیں تو شگفتہ تھے بیلے کے پھول — کہیں عطر افشاں تھے چمپے کے پھول
نہ خالی تھی پھولوں سے تِل بھر زمیں — گلوں سے ہوا تھی معطر زمیں
ہوا سے تھیں شاخیں جھکی اسطرح — جھکائے دلہن ہو نظر جس طرح
مدن بان کی اور ہی شان تھی — وہ بو باس تھی عقل حیران تھی
مہک اس کی سارے چمن سے جُدا — سمن سے جُدا یاسمن سے جُدا
مئے ناب کا تھا اثر پھول میں — مہک ساغر مل کی ہر پھول میں
دوا پھول ہر زخم ہر داغ کی — بہار ایک غنچے میں اک باغ کی
لگی سونگھنے اک چنبیلی کا پھول — لگی توڑنے ایک جوہی کا پھول
لگی گوندھنے ہار اک نازنیں — بنانے لگی ایک گجرا وہیں
رواں نہر اک باغ کے درمیاں — نہانے کو عمدہ بنیں سیڑھیاں
چمکتی ہوئی سیم سے بھی سوا — دلاویز تسنیم سے بھی سوا
جگہ وہ بہت ہی خوش آئی انھیں — نہایت ہی وہ نہر بھائی انھیں

ہوا بھا گئی، وہ فضا بھا گئی
دلوں میں نہانے کی لہر آ گئی

پہن کر گریں ساڑیاں نہر میں
ہوئیں جا کے جلوہ کناں نہر میں

کوئی تو کنارے سے نہانے لگی
کوئی بڑھ کے غوطے لگانے لگی

کنارے سے کوئی اس کے اندر کوئی
سکھانے لگی بال دھو کر کوئی

جھٹک کر لٹیں دوش پر ڈال دیں
ادھر ڈال دیں کچھ اُدھر ڈال دیں

یہ پانی میں ان کا اثر آ گیا!
چنبیلی کا تیل اس سے سترہا گیا

جو اتری تھیں وہ شعلہ رو نہر میں
تو بجلی چمکتی تھی ہر لہر میں

منور وہ آب اس کا سارا ہوا
اٹھا بلبلا جو ستارا ہوا

جو پانی پڑا اور بھیگا بدن
چھپا ساڑیوں میں نہ انکا بدن

لپٹ کر وہ جیسے بدن ہو گئیں
برہنہ وسب سیم تن ہو گئیں

کسی کا وہاں زور چلتا نہ تھا
سنبھالے سے جوبن سنبھلتا نہ تھا

پری بن گئی پدمنی اور بھی
جو بھیگی تو وہ اڑ چلی اور بھی

عجب نور تھا جسم شفاف پر
پھسلتا تھا پانی تن صاف پر

کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی
تو عکس بدن سے گہر ہو گئی

ہوا بھیگنے سے بدن اس طرح
کوئی پھول شبنم سے تر جس طرح

کسی سے وہ گل ملتی جلتی نہ تھی
کسی پھول کے ساتھ تلتی نہ تھی

وہ اس طرح ان گلعذاروں میں تھی
کہ مہتاب گویا ستاروں میں تھی

یہاں تو اس عیش و عشرت میں تھی
وہاں جان طوطے کی آفت میں تھی

کوئی پدمنی کی پرستار تھی
کنیزوں میں وہ سبکی سردار تھی

اُسے پدمنی ساتھ لاتی نہ تھی
ضرورت سے ہمراہ آئی نہ تھی

کسی سے تھی وہ دل لگائے ہوئے
محبت تھی یا ہم بڑھائے ہوئے

یہ موقع جو پایا دل اس کا کھلا
کہ موقع یہ ملنے کا اچھا ملا

وہ ملنے کا سامان کرنے لگی
تکلف سے بننے سنورنے لگی

وہ چیزیں جو کمرے کی زینت کی تھیں — جو خاص اس حسین کی ضرورت کی تھیں
وہ سب صرف میں اپنے لانے لگی — مسی سرمہ ملنے لگانے لگی
اٹھا خاصداں، عطرداں لے چلی — یہاں کا وہ ساماں وہاں لے چلی
یہ توتے نے دیکھا قفس سے جو حال — تو پہونچا بہت اس کے دل پر ملال
لگا کہنے خادمہ بے تمیز — ذلیل جہاں بے حیا بے تمیز
یہ باتیں ترے حق میں بہتر نہیں — تجھے اپنے مالک کا کچھ ڈر نہیں
اگر اس سے وہ بت خبردار ہو — تو پھر کیا ترا حال مُردار ہو
یہ سُن کر بہت خادمہ ڈر گئی — ندامت سے جیتے ہی جی مر گئی
اثر رُخ سے ڈر کا ہویدا ہوا — یہ دھڑکا یہ غم دل میں پیدا ہوا
کہ یہ پدمنی کو نہ بھر دے کہیں — مرا حال ظاہر نہ کر دے کہیں
ہوا شاق توتے کا کہنا اسے — ہوا زہر اس کا یہ کہنا اسے
قفس سے لیا کھینچ مُردار نے — لگی بے خطا اس کو وہ مارنے
اسی وقت گھر سے نکالا اسے — کسی چاہ میں جا کے ڈالا اسے
وہ گُلپوش جب شام کو آئی گھر — سُنی خادمہ سے یہ اس نے خبر
کہ بلی نے ڈھا دی قیامت یہاں — پرندے کو وہ کھا گئی ناگہاں
یہ سُن کر بری اس کی حالت ہوئی — مبدل الم سے مسرت ہوئی!
بہا سُرمۂ چشم آنسو کے ساتھ — ہوا دل پریشاں گیسو کے ساتھ
بہت اس نے توتے کا ماتم کیا — بہت اس نے اس کے لئے غم کیا

توتے کا کنوئیں سے نکل کر چڑیمار کے جال میں پھنسنا

کدھر آج تو میرے ساقی گیا — غضب سے مری سن کے بھر پی گیا
یہ کیوں اِتنی غفلت تری بڑھ گئی — ابھی سے تجھے اس قدر چڑھ گئی
نہ کب تک مجھے پلائیگا تو — کنوئیں مجھ کو کب تک جھکائے گا تو

رہائی عطا کر الم سے مجھے
نکال آ کے اس چاہ غم سے مجھے

وہ بے بس پرندہ جو اس چاہ میں
گرا عالم حسرت و آہ میں

تو بیچارہ چوٹ اور بھی کھا گیا
کنواں دیکھ کر اور گھبرا گیا

مگر سخت جاں بھی بلا ہی کا تھا
نشانہ وہ تیر جفا ہی کا تھا

وہ چوٹ اور تکلیف سب سہہ گیا
مرا وہ نہ جیتا ہی بھر رہ گیا

گیا گرتے ہی وہ سنبھل جلد ہی
وہ اس میں سے آیا نکل جلد ہی

لب چاہ اک آم کا تھا درخت
بڑا سایہ دار اور اونچا درخت

وہ بیٹھا پھر اڑ کر اسی پیڑ پر
ہوا خوش بہت اس کا جی پیڑ پر

مگر وہ سمن بر جو یاد آ گئی
تو دل پر اک افسردگی چھا گئی

غم ہجر دل اس کا ملنے لگا
ذرا سا کلیجا اچھلنے لگا

کیا قصد پھر اس سے جا کر ملوں
پھر اس سے یہ صدمے اٹھا کر ملوں

کہوں حال کمبخت مردار کا
بد اطوار بد چال بدکار کا

مگر پھر یہ سوچا کہ بہتر نہیں
جہاں یہ ہوا پھر چلوں میں وہیں

اڑا واں سے صحرا کو یہ سوچ کر
ملا واں کے ٹوٹوں میں کر کے سفر

مگر پدمنی کے لیے بے قرار
دل زار مضطر جگر بے قرار

تڑپتا کبھی سر پٹکتا کبھی
کبھی نوچتا پر پھڑکتا کبھی

لہو روتے روتے جو تر ہو گئے
زمرد سے لال اسکے پر ہو گئے

شکایت کبھی اسکو گردوں سے تھی
کبھی اپنے ہی بخت واژوں سے تھی

نہ اس پر بھی آرام آیا نظر!
ہوا اک چڑیمار کا واں گزر

پھنسا اس کے تزویر کے جال میں
پڑا اور بھی اب وہ جنجال میں

چتوڑ گڑھ کے ایک برہمن کا سراندیپ جانا اور توتے کو مول لیکر واپس آنا اور رتن سین کے ہاتھ بیچنا

ہوا مجھ سے ساقی خفا کس لیئے
نظر تو نہ تھا پھر گیا کس لیئے

ترے طور بے طور کیوں ہو گئے
ارے بندیہ دور کیوں ہو گئے

جو جاری ہے وہ فیض تو کم نہ کر
جمی ہے جو محفل تو برہم نہ کر

پلائی ہے مے تو پلاتا ہی جا
پیالے لبوں سے لگاتا ہی جا

اب آگے ہے یہ داستاں اس طرح
ملک نے کیا ہے بیاں اس طرح

کہ اک تاجر نامور ذی وقار
جہاں گرد فہمیدہ و ہوشیار

سراندیپ چتوڑ گڑھ سے چلا
چلا ساتھ اس کے بڑا قافلہ

سفر اک برہمن بھی کرتا چلا
دم اس شہر کا دل سے بھرتا چلا

پہونچ کر وہاں خوش ہوئے سب کمال
لیا سب نے تھوڑا بہت جنس و مال

کچھ اسباب بیچا خریدا ابھی کچھ
حسینوں کا دیکھا تماشا بھی کچھ

انھیں کا وہاں گرم بازار تھا
انھیں کا زمانہ خریدار تھا

جدھر جائیے دل گنوا آئیے
جگر پر نیا زخم کھا آئیے

برہمن نے واں ایک توتا لیا
یہی اس نے واں ایک سودا لیا

یہ توتا وہی نغمہ پرواز تھا
کہ پدماتی کا جو دمساز تھا

اب آیا جو واپس وہ کل قافلہ
ہوا شہر میں سب کا پھر داخلہ

جو توتے کی ہر سمت شہرت ہوئی
بڑی برہمن کی بھی عزت ہوئی

یہاں تک تمام اس کا شہرہ ہوا
کہ راجا کی محفل میں چرچا ہوا

اسی وقت فرمان صادر ہوا
برہمن اسے لیکے حاضر ہوا

وہاں اس نے جادو بیانی وہ کی
سر انجمن گلفشانی وہ کی

کہ راجہ کا دل اس نے بھڑکا دیا
اسے برہمن سے وہیں لے لیا

مگر برہمن کو بھی خوش کر دیا
زر و سیم سے اس کا گھر بھر دیا

ہوئی اس کی رانی بھی خوش دیکھ کر
وہ رکھنے لگی اس کو پیش نظر

یہ راجہ تھا حد سے سوا نامور
بہادر، جری نوجواں دادگر

عقیل و ذکی خوبصورت حسیں
نہایت وجیہہ اور نہایت حسیں

نہ تھا سترہ سال سے سن سوا
ابھی حال میں تھا ہوا کتخدا

رتن سین تھا اس کا مشہور نام
وجاہت کا تھا اس کے شہرہ تمام

یونہی اس کی رانی بھی تھی مہ جبیں
طرحدار نمکیں کم سن حسیں

بڑی باحیا صاحب تمکنت
اور اس حور کا نام تھا ناگمت

ناگمت کا نکھر کر اپنی صورت پر فریفتہ ہونا. توتے سے الجھنا. رتن سین کا توتے سے پدماوت کا حال سن کر عاشق ہونا اور سراندیپ جانا

نہ تھی پہلے ایسی تو غفلت تجھے
ہوئی کب سے ساقی یہ نخوت تجھے

کسی کو تو اب پوچھتا ہی نہیں
وہ ساغر نہیں وہ صراحی نہیں

خدا کے لیے اب خبر لے ذرا
دوائے قرار جگر دے ذرا

ترا ناز بیجا یہ بھاتا نہیں
مجھے یہ تکبر خوش آتا نہیں

اٹھا جام و مینا نہ اب دیر کر
خدا را مجھے سیر کر سیر کر

ہوئی ایک دن صبح جب آشکار
چلی ناگمت اپنا کرنے سنگار

نہا کر گھنے بال پھیلا دیئے
جفا کار نے جال پھیلا دیئے

بڑھی سانپ کی طرح لہرا کے زلف
زمیں پر لگی لوٹنے آ کے زلف

لٹک کر جو چھل بل وہ دکھلا گئی
تو پتلی کمر تین بل کھا گئی

ہوا شک جہاں بوئے کاکل گئی
کہ شیشی کوئی عطر کی کھل گئی

بہت شوخ ہاتھوں میں مہندی ملی
لبوں پر دھواں دھار مسّی ملی

ستم اس پہ لاکھا جما کر گیا
جفا پر جفا پان کھا کر گیا

لگایا جو کاجل ستم ڈھا دیا
نظر پھیر کر سب کو تڑپا دیا

سجاوٹ کی کوشش میں پہروں رہی
بہت فکر کوشش میں پہروں رہی

کیا اُس نے آخر وہ جوڑا پسند
ہوئی شان حسن اور جن سے بلند

دوپٹے کو کچھ سر سے سرکا دیا
اک آنچل کو کاندھے سے لٹکا دیا

ملا عطر ایسا مکاں بس گیا
زمیں بس گئی، آسماں بس گیا

بہت شوخ اور چلبلی ہر ادا
دل آزاریوں پر تلی ہر ادا

کمر بال سی، سینہ نکلا ہوا
جوانی کے دن حُسن ابلا ہوا

کمر نازکی سے لچکتی ہوئی
پس پشت چوٹی لٹکتی ہوئی

اُٹھایا نگاہوں کا بھالا کبھی
بل ابرو پہ گیسو کا ڈالا کبھی

اسی طرح بن ٹھن کے وہ گلبدن
نئے سر سے چوتھی کی بن کے دلہن

پھر آئینہ خانے میں داخل ہوئی
وہ صورت سے اپنی مقابل ہوئی

جو حُسن خُدا داد پر کی نظر
تو تھی وہ تجلی نہ ٹھہری نظر

وہ خود آپ پر شیفتہ ہو گئی
فدا ہو گئی، مبتلا ہو گئی

طبیعت تو تھی آخر آ ہی گئی
مقابل کی تھی چوٹ کھا ہی گئی

کبھی ہو گئی اپنی چتون پہ لوٹ
کبھی ہو گئی اُٹھتے جوبن پہ لوٹ

کبھی اپنے چہرے کو تکتی رہی
کبھی گیسوؤں پر پھڑکتی رہی

رہی محو ہو کر نہ پھر ہوش میں
خواصوں سے بولی اسی جوش میں

کہ دنیا میں میں حُسن والی ہوں کیا
سجیلی ہوں کیا بھولی بھالی ہوں کیا

چمک کیا مرے چکنے گالوں میں ہے
لٹک کیا مرے لمبے بالوں میں ہے

طرحدار ہیں انکھڑیاں کس قدر
بھری ان میں ہیں شوخیاں کس قدر

نظر کہہ رہی ہے کہ نشتر ہوں میں
چھری سے کٹاری سے بڑھ کر ہوں میں

ستم ڈھا رہی ہیں ادائیں مری
چھین لے رہی ہے بلائیں مری

ملی ہے جہاں میں یہ چتون کسے
دیا ہے خدا نے یہ جوبن کسے

نہیں ٹھیک اس وقت حالت مری
لیے لیتی ہے جان صورت مری

کہوں تم سے کیا آرزو دل کی ہے
یہی اس گھڑی گفتگو دل کی ہے

کہ منہ چوم لوں اپنا ہی میں
رہوں دیکھتی اپنا مکھڑا ہی میں

لگیں کہنے وہ بھی کہیں کیا حضور
نہیں حسن ایسا تو دیکھا حضور

نظر ایسی صورت تو آتی نہیں
یہ صورت تو پریوں نے پائی نہیں

یہ حوروں میں ناز و کرشمہ کہاں
یہ عشوہ کہاں اور یہ غمزہ کہاں

دہن نور کے دونوں لب نور کے
جو اعضا بدن میں ہیں سب نور کے

یہ سن کر ہوئی اور مغرور وہ
ہوئی نشۂ حسن سے چور وہ

وہاں سے چلی آئی توتے کے پاس
وہ تشریف لائی پرندے کے پاس

کہا اے زمانے کو جھیلے ہوئے
اکھاڑے میں پریوں کے کھیلے ہوئے

قسم ہے تجھے اپنے ایمان کی
رتن سین کے سر مری جان کی

نظر آئی ہے یہ ملاحت کہیں
مری سی بھی دیکھی ہے صورت کہیں

سراندیپ کا حسن مشہور ہے
وہاں جو ہے وہ غیرت حور ہے

اسی دیس کا رہنے والا ہے تو
حسینوں کے ہاتھوں کا پالا ہے تو

بتا واں بھی ایسی حسیں ہے کوئی
مری طرح بھی نازنیں ہے کوئی

کہا اس نے شک کیا ہے اچھی بھی ہو
رسیلی بھی ہو بانکی ترچھی بھی ہو

وہی سب میں ہے خوبصورت بہت
کہ شوہر کو ہو جس سے الفت بہت

جو معمولی توتے نے تعریف کی
زیادہ نہ اس بت کی توصیف کی

تو کچھ خوش نہ وہ شوخ خود بیں ہوئی
طبیعت کو اس کے نہ تسکیں ہوئی

کہا تو نے تعریف توتے نہ کی
مرے حسن کی داد تو نے نہ دی

سوا مجھ سے کوئی حسیں ہوگا کیا
برابر مرے نازنیں ہوگا کیا

نہ ضبط اس سے یہ بات سُنکر ہوا
یہ کہنا گراں اسکے دل پر ہوا

کہا اس نے یہ ناز اچھا نہیں
تکبّر حسینوں کو زیبا نہیں

تکبّر ہے اللہ کو ناپسند
نہیں کبر اس کو کسی کا پسند

وہ خالق ہے اس کی ہے قدرت بڑی
وہ صانع ہے رکھتا ہے صنعت بڑی

بنائی ہیں وہ وہ حسیں صورتیں
پری صورتیں نازنیں صورتیں

کہ خود ہی وہ صانع ہے ان پر فدا
جہاں میں ہے ان کا بڑا مرتبا

حسینوں سے خالی یہ خلقت نہیں
کسی بُت کو سب پر فضیلت نہیں

سراندیپ میں ایک گلفام ہے
پریزاد ہے پدمنی نام ہے!!

بنایا ہے خالق نے ایسا اُسے
کہ زاہد بھی کرتے ہیں سجدا اسے

یہ کہتے ہیں جتنے ہیں اس دیس میں
پری ہے یہ انسان کے بھیس میں

نہیں ایسی صورت تو دیکھی کہیں
نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہوگی کہیں

جو تم اس کو دیکھو تو دل تھام لو
نہ پھر عمر بھر حُسن کا نام لو

غضب ناک وہ اس کو سنکر ہوئی
لگا اپنے جامے سے باہر ہوئی

ہوا سُرخ منہ لب چبانے لگی
غضب میں بھری تھرتھرانے لگی

بہت منفعل وہ رنگیلی ہوئی
بہت اس پہ وہ لال پیلی ہوئی

کہا خادمہ سے کہ لے جا اُسے
چکھا دے مزہ شوخیوں کا اسے

ابھی ذبح کر اس کو لے جاکے تو
مجھے مطمئن کر ابھی آکے تو!

یہ توتا نہیں فتنۂ دہر ہے
قیام اس کا میرے لیے زہر ہے

یہ راجہ کو اک دن بھرے گا ضرور
صفت پدمنی کی کرے گا ضرور

وہ سُن کر فدا اس پہ ہو جائے گا
مرے ہاتھ سے مفت کھو جائیگا

نکل جائے گی دل سے اُلفت مری
نہ باقی رہے گی محبت مری

بہت جلد یاں سے اسے دُور کر
تردد مٹا مجھکو مسرور کر

رتن سین اس وقت گھر میں نہ تھا
کہیں صبح سے تھا وہ باہر گیا

دیا خادمہ کو جو حکم اس طرح — تو تعمیل کرتی نہ وہ کس طرح
قفس وہ پرندے کا لیکر چلی — مگر ڈر سے راجہ کے مُضطر چلی
کہ گر وہ کبھی اس سے ماہر ہوا — یہ احوال توتے کا ظاہر ہوا
تو رانی پہ تو کچھ نہ حرف آئیگا — یہ خون اس کا میرے ہی سر جائیگا
خیال اس کا جس وقت آیا اُسے — تو اپنے مکاں میں چھپایا اُسے
کہا آکے جھگڑا مٹا آئی ہیں — نہ خاک اس کو دیا آئی ہیں
رتن سین آیا جو اب اپنے گھر — تو توتے کی دی ناگمت نے خبر
کہ بلی قفس سے اسے کھا گئی — جفا کار ہم سب کو تڑپا گئی!
یہ سُن کر بہت ہی اُسے غم ہوا — وہ سامان راحت کا برہم ہوا
کہا خادمہ سب گئی تھیں کہاں — رہا کیوں اکیلا وہ شیریں زباں
خواصوں کو بلوا کے کہنے لگا — کہو کون دیجائے تم کو سزا
یہ سُنکر وہ سب تھرتھرانے لگیں — سب آنکھوں سے آنسو بہانے لگیں
وہ محرم تو اس طرح گھبرا گئی! — کہ دہشت سے ہونٹوں پہ جان آگئی
لگی کہنے گر عفو ہو یہ خطا! — تو اس کا لگاؤں کہیں میں پتا
یہ سُنکر اُسے کچھ تسلی ہوئی — طبیعت کو کچھ کچھ تشفی ہوئی
کہا پھر تامل ہے کیا جا ابھی — ملے وہ جہاں ڈھونڈھ کر لا ابھی
ملی جو وہاں سے رہائی اسے — تو وہ گھر گئی اور لائی اُسے
بہت خوش اُسے پا کے راجا ہوا — ہوا دفع غم۔ رفع غصا ہوا
مگر حال توتے سے پوچھا نہ کچھ — گیا ٹال اُس وقت چھیڑا نہ کچھ
اکیلا جو باہر وہ آکر ہوا — تو پرساں وہ اسکو منگا کر ہوا
کہ احوال اپنا بیاں کر ذرا — جو کچھ آج گزری عیاں کر ذرا
پرندے نے ساری حقیقت کہی — وہ رانی کی پوری حکایت کہی
کہا اس کے ناحق بگڑنے کا حال — کہا جان کے پیچھے پڑنے کا حال

کنیزک کا وہ رحم کھانا کہا — مکاں میں قفس کا چھپانا کہا
جو گزرا تھا وہ ماجرا کہہ دیا — چھپایا نہ کل واقعہ کہہ دیا
گیا سنتے ہی اس کے دل کا قرار — رہا دل پہ باقی نہ پھر اختیار
وہ بسمل ہوا اس کے نخچیر سا — کلیجے پہ اس کے لگا تیر سا
کہا پدمنی کوں گلفام ہے — وہ بت کس کی لڑکی ہے کیا نام ہے
ابھی تک وہ کمسن ہے نا کتخدا — کہیں ہو گئی ہے وہ یا کتخدا
سکونت کا اس کی پتا دے مجھے — جہاں ہو وہ ظالم بتا دے مجھے
یہ سنکر پرندہ ہراساں ہوا — بہت اپنے دل میں پشیماں ہوا
لگا کہنے دل میں کہ آفت ہوئی — بڑی سخت مجھ سے حماقت ہوئی
یہ اس نازنیں پر فدا ہو گیا — حقیقت میں یہ ہاتھ سے کھو گیا
لگا کہنے اے تاجدار جہاں — وحید جہاں شہریار جہاں
نہ قصہ کہانی پہ تو کان کر — پیالہ نہ پی زہر کا جان کر
سنبھل دیکھ کیا قہر کرتا ہے تو — یہ کیوں پاؤں دلدل میں دھرتا ہے تو
کڑی ہے محبت کی منزل بہت — وہاں تک پہنچنا ہے مشکل بہت
کہا مان اس میں ہے ڈر جان کا — خطر جان کا ہے ضرر جان کا
نہ لے نام عشق ستمگار کا — نہ کر ذکر تو اس جفاکار کا
ابھی تک اسے جانتا تو نہیں — ستمگر کو پہچانتا تو نہیں
ارے داغ پر داغ دیتا ہے یہ — برے طور سے جان لیتا ہے یہ
جگر میں یہ ہوتا ہے نالا کبھی — کلیجے کا بنتا ہے چھالا کبھی
گلے کا یہ خنجر کبھی بن گیا — رگ جاں کا نشتر کبھی بن گیا
کبھی زخم دل کا نمکداں ہوا — جگر میں کبھی نوک پیکاں ہوا
نظر جس پہ کی جی سے کھویا اسے — دیا جس کو پانی ڈبویا اسے!!
بڑا ظلم کرتا ہے دل لیکے یہ — رلاتا ہے داغ جگر دیکے یہ

گئے خاک میں مل جری سیکڑوں ڈبو دی ہیں ناویں بھری سیکڑوں
قیامت کی اس بحر کی لہر ہے جو قطرہ ہے وہ سانپ کا زہر ہے
نہ مانے گا کہنا تو پچھتائے گا بچے گا نہ بے موت مرجائے گا
کہا اس نے اب اس سے حاصل نہیں مرا زخم مرہم کے قابل نہیں
جو ہونا تھا تقدیر میں ہو چکا رہِ عشق میں اب تو دل کھو چکا
جو ہے ہونے والا وہ ٹلتا نہیں مقدر کا لکھا بدلتا نہیں
تو اس بت کا احوال پنہاں نہ کر خدا کے لیے اب پریشاں نہ کر
بتا جلد ورنہ مر جاؤں گا! اسی وقت جی سے گزر جاؤں گا
نہ تو تا بچا آخر انکار سے ہوا سخت مجبور اصرار سے!
کہا خیر سن، ہے اگر دھن یہی جگر تھام کر بیٹھ جا سن یہی
وہ گلرو ہے راجہ کی نور نظر وہ رکھتا ہے ہر دم حضور نظر
فدا اس پہ ماں باپ قربان ہے وہی روح ان کی وہی جان ہے
نظر آنکھ میں، آرزو دل میں ہے چمن میں ہے گل، شمع محفل میں ہے
عجب حسن پایا ہے اس ماہ نے بنایا ہے آپ اس کو اللہ نے
ستم پر ستم اس کی ڈھاتی ہے لف دلوں کو لبھا کر پھنساتی ہے زلف
بڑی قد سے بھی اسکی لمبان ہے وہ چھل بل ہے ناگن بھی قربان ہے
وہ مانگ اس کی ہے راہ ظلمات کی جبیں چاندنی چودھویں رات کی
وہ چنچل بھویں تیغ سے کم نہیں انھیں اپنے مقتول کا غم نہیں
قیامت کی شوخی بھری آنکھ میں ہمیشہ سے تیلی ہری آنکھ میں!
ستمگر فسوں ساز دونوں بہم! کٹیلی دغا باز دونوں بہم!
نظر سے ہے جی پر بنی اور کبھی بھری اس میں ہے موہنی اور کبھی
حسیں شمع کی لو سے بھی ناک ہے عیاں صنعت ایزد پاک ہے
صباحت گل تر کی گالوں میں ہے عجب بات ان حسن والوں میں ہے

کوئی پھول ایسا چمن میں نہیں !! | یہ رنگت سمن نسترن میں نہیں !
سوا ہونٹھ یاقوت سے لال ہیں | وہ بے پان کھائے ہوئے لال ہیں
عجب اس کا منہ ہے عجب دانت ہیں | ڈھلے ایک سانچے میں سب دانت ہیں
نہ بیلے کی کلیاں حسیں اس طرح | نہ موتی کی لڑیاں کہیں اس طرح
ڈھلا اس کا سانچے میں سارا گلا | صراحی سے بھی بڑھ کے پیارا گلا
صفائی سے اس کی نظر دنگ ہے | عیاں پان کے پیک کا رنگ ہے
وہ نوخیز جوبن کا عالم غضب | اُبھار ان کا سینے پہ کم کم غضب
کمر ہی کے حصے میں آیا ہے لوچ | رگ گل سے بھی بڑھ کے پایا ہے لوچ
ملائم ہیں دست حنائی بہت ! | نزاکت لئے ہے کلائی بہت !
تصدق ہیں گلہائے تر پیٹ پر | پھسلتا ہے پائے نظر پیٹ پر
وہ باہر بری مارح گوئی سے ہے | سوا نرم میدے کی لوئی سے ہے
وہ رانیں بھری چکنی چکنی سڈول | بہت ہی مناسب بہت ہی سڈول
ڈھلیں اور اس طرح شفاف صاف | کہ منہ دیکھ لے آدمی صاف صاف
وہ تلوے کہ آئینہ حیران ہے | صفائی پہ دونوں کی قربان ہے
حنا ان سے منہ موڑتی ہی نہیں | گھڑی بھر قدم چھوڑتی ہی نہیں
چلی جب ذرا چال وہ چل گئی | کہ دل اپنے تلووں سے مل دل گئی
نہ دہرا نہ ایسا اکہرا بدن ! | نہایت ہی موزوں چھریرا بدن
سب اعضا نے چھپے کا پایا ہے رنگ | اسی گل کے حصے میں آیا ہے رنگ
پسینے کی خوشبو سوا عطر سے | بدن سر سے پا تک بسا عطر سے
جو باتیں ہیں وہ بانکپن کو لئے | ادائیں جو ہیں وہ بھبن کو لئے
سرور جگر راحت دل ہے وہ | کلیجے میں رکھنے کے قابل ہے وہ
یہ جی چاہتا ہے کہ دیکھا کرے | کرے تو اسی بت کو سجدا کرے
ابھی اس پہ وہ ماہ کامل نہیں | ستم قہر ڈھانے کے قابل نہیں

اسے دخل ناز و ادا میں نہیں — وہ مشاق جور و جفا میں نہیں
نہیں جانتی وہ نکھرنا ابھی — نہیں اس نے سیکھا سنورنا ابھی
وہ گلپوش ہے اٹھتی کونپل ابھی — ہے کچا ہی وہ ناز کا پھل ابھی
ابھی اتری منت کی ہنسلی نہیں — ابھی پوری چودہ برس کی نہیں
ابھی اس کے ہیں اٹھتے جوبن کے دن — ہنسی کھیل کے چلبلے پن کے دن
نہیں وہ بنی ہے دلہن اب تلک — اچھوتی ہے وہ گلبدن اب تلک
ہر اک ملک سے روز آتے ہیں لوگ — قرابت کے پیغام لاتے ہیں لوگ
مگر باپ کو کوئی بھاتا نہیں — بر اس گل کے قابل وہ پاتا نہیں
تری دیکھ لے ہاں وہ صورت اگر — بھلے اس پہ تیری لیاقت اگر
تو سمجھے عجب کیا وہ فائق تجھے — تصور کرے اس کے لائق تجھے
یہ سن کر وہ بیخود ہوا اور بھی — ہوا جوش دل کا سوا اور بھی
لہو دونوں آنکھیں بہانے لگیں — قیامت کا طوفاں اٹھانے لگیں
گئے دل سے صبر و قرار اسکے بھاگ — لگا دی جگر میں محبت نے آگ
یہ دھڑکن تھی ہاتھوں اچھلتا تھا دل — سنبھالے نہ اس کو سنبھلتا تھا دل
کبھی ہوش میں اپنے تھا غش کبھی — لبوں پہ تھی آہ جگر کش کبھی
گھٹی طاقت جسم وحشت بڑھی — گھٹا خون سارا، نقاہت بڑھی
نہ دل میں وہ جوش جوانی رہا — نہ شوق مئے ارغوانی رہا
نہ تھا ایک ساعت بھی اسکو قرار — یہی بات توتے سے تھی بار بار
ذرا مہرباں پھر ترانہ وہی — سنا دے مجھے پھر فسانہ وہی
بستا جس میں وہ غیرت حور ہے — وہ نزدیک ہے ملک یا دور ہے
کبھی ہم نے وہ شہر دیکھا نہیں — بھلا ہم پہنچ جائیں گے یا نہیں
یہی فکر بس اس کو دن رات تھی — نہ اس کے سوا دوسری بات تھی
سب احباب دمساز تنگ آ گئے — وزیر و مصاحب بھی گھبرا گئے

کہا سب نے یہ رنج اچھا نہیں — یہ غم بادشاہوں کو زیبا نہیں
یہ نام اور سرکار کا حال یہ — پرندے کے کہنے پہ احوال یہ
جہاندیدہ دی فہم سرکار سا — پڑے چارپائی پہ بیمار سا
ٹھنی ہے یہی جو دل پاک میں — تو مل جائے گی سلطنت خاک میں
مگر کچھ ہوا وہ نہ سُنکر خبر — ہوا دل پہ اسکے نہ کچھ بھی اثر
ہوا بلکہ وہ مضمحل اور بھی! — تڑپنے لگا اس کا دل اور بھی!
ہوا تھا جو دل لوٹ پہلے پہل — لگی تھی جو یہ چوٹ پہلے پہل
تو در جگر چین لیتا نہ تھا — گھڑی بھر کو فرصت وہ دیتا نہ تھا
بہلتا نہ گلشن نہ صحرا میں دل! — لگا تھا اسی شوخ رعنا میں دل
کسی دم نہ قابو میں آتا تھا دل — نیا رنگ ہر وقت لاتا تھا دل
اثر خون دل کا ہر آنسو میں تھا — تقاضا یہی دل کا پہلو میں تھا
کہ ہے ضبط کی بھی کوئی انتہا — بس اب صبر کی ہو چکی انتہا
جو چلنا ہے تو ملک جاناں کو چل — نکل جلد اپنے مکاں سے نکل!
وہ آخر کو تیار ہو ہی گیا — حکومت سے بیزار ہو ہی گیا!
سر بزم اسی دم منگائی بھبوت — سر و تن پہ اپنے رمائی بھبوت
کیا چاک وہ جسم کا پیرہن — کیا زیب تن گیروا پیرہن
بہت وضع پہ اس پہ زیبا ہوئی — بھبوت اس کے چہرے کا غازہ ہوئی
کھلا دوش پر مرگ چھالا بہت — سجا ہاتھ میں اس کے مالا بہت
مصاحب تھے اس کے وہاں جس قدر — بنے جوگی وہ سب بھی آئے نظر
وہ سب اس کے ہمراہ ہو کر چلے — وہ آرام سب اپنا کھو کر چلے
بُرا ماں کا حال اسکے غم میں ہوا — جگر ٹکڑے ٹکڑے الم سے ہوا!
کہا کیا ہوا ہائے بیٹا تجھے — نہ تھا آج تک تو یہ سودا تجھے
کہاں تو چلا مجھ سے منہ موڑ کر — بڑھاپے میں میری کمر توڑ کر

تجھی تک تو ہے زندگانی مری ! ضعیفی میں ہے تو جوانی مری
یہ امید تجھ سے تو بیٹا نہ تھی سمجھتی تجھے میں تو ایسا نہ تھی
اِدھر ماں پریشان کا حال تھا اُدھر ناگمت کا یہ احوال تھا
سنبھلتی نہ تھی جان کھوئی تھی وہ یہ کہتی تھی وہ اور روتی تھی وہ
کہ کیا ہوگیا تجھ کو اک آن میں دیا پھونک توتے نے کیا کان میں
یقین اس کا کہنا یہ کیوں کر لیا ارے جوگ تو نے یہ کس پر لیا
محبت مری تو نے کیوں چھوڑ دی مری تو نے اُمید کیوں توڑ دی
خُدا کے لیے کر نہ یہ قہر تو نہیں تو کھلا دے مجھے زہر تو
نہو یہ کبھی تو مجکو لے اپنے ساتھ ہوں میں بھی جوگن چلوں تیرے ساتھ
کہوں کیا کہ وہ دن کس آفت کا تھا بیان ناگمت کا قیامت کا تھا
پریشان چھوٹے بڑے غم سے تھے بہت تنگ سب اس کے ماتم سے تھے
بلکتی تھی سب کو رُلاتی تھی وہ رتن سین سے لپٹی جاتی تھی وہ
رتن سین کو بھی تھا صدمہ بہت پریشاں تھا غم سے دل اسکا [illegible]
ٹپکتے تھے آنکھوں سے بہ بہ کے اشک ڈھلکتے تھے پلکوں سے رہ رہ کے اشک
مگر کیا کرے دل سے مجبور تھا رہے باز اتنا نہ مقدور تھا
چلا آخر ان سب سے منھ موڑ کر چلا اپنی وہ سلطنت چھوڑ کر
پیادہ سوئے ملک دلبر چلا کبھی خوش کبھی غم سے مضطر چلا
قفس سے دیا کھول توتے کو بھی لیا ساتھ اپنے پرندے کو بھی
وہی راہ میں ان کا رہبر ہوا وہی آگے ان سب کے اُڑ کر ہوا
وہ دن جیٹھ بیساکھ کے اور وہ دھوپ ہر اک شے تھی بدلے ہوئے اپنا روپ
جگر خشک ہوتے تھے لب کی طرح سیہ فام دن بھی تھا شب کی طرح
بڑا دھوپ کا زور دُنیا میں تھا سمندر بھی پوشیدہ دریا میں تھا
جہاں جو مسافر تھا وہ تھا سیاہ جس آہو کو دیکھا سراپا سیاہ

جو غنچہ تھا شک اس پہ تھا خار کا
جو پتہ تھا چہرہ تھا بیمار کا

طپش سے تھے چھالے جگر میں پڑے
پھپھولے تھے پاتے نظر میں پڑے

وہ جلنا وہاں لو کا اللہ رے
چمکنا وہ بالو کا اللہ رے

ہوا آگ تھی، ہر سماں آگ تھا
زمیں آگ تھی آسماں آگ تھا

بگھول دو گھڑی کو ترستی تھی آگ
لگاتار دن بھر برستی تھی آگ

یہ سوزش تھی چھالے گہر ہو گئے
جو ذرے اڑے وہ شرر ہو گئے

جلاتی تھی دل کو ہوا اس طرح
زمیں گرم جلتا توا جس طرح

درختوں کے سب پھل پھول بھن گئے
اڑے جو پرندے وہ جل بھن گئے

ہرا نخل کوئی نہ پایا کہیں!
نظر سبز پتا نہ آیا کہیں

بیاں کیا کروں تھی کس آفت کی دھوپ
قیامت کے دن تھے قیامت کی دھوپ

اسی دھوپ میں دشت پیما تھے وہ
پریشاں تھے مضطر تھے رسوا تھے وہ

ہزاروں تھے تلوؤں میں چھالے پڑے
ہر اک کو تھے جینے کے لالے پڑے

مگر پھر بھی لیتے نہ تھے دم کہیں
قریب ان کے آتا نہ تھا غم کہیں!

خصوصاً وہ تازہ گرفتار عشق
جگر چاک نا تجربہ کار عشق

بہت تیز رو قطع منزل میں تھا
عجب طرح کا ولولہ دل میں تھا

یہی چاہتا تھا نہ ٹھہروں کہیں
جو دم لوں تو اب میں پہنچ کر وہیں

غرض راہ میں وہ نہ دم بھر رکے
کنارے سمندر کے آ کر رکے

چلے واں سے پھر سب سنگا کر جہاز
اڑا کھول کر بال پر کا جہاز

مگر تھا نہ اس خستہ دل کو قرار
ترقی پہ دل کا تھا اضطرار

کبھی اپنے حال پریشاں کا غم
کبھی ناگمت کا کبھی مال کا غم

کبھی سلطنت کا الم کچھ اسے
کبھی گھر کے چھٹنے کا غم کچھ اسے

جب آتا مگر پدمنی کا خیال!
تو باقی نہ رہتا کسی کا خیال

جہاں ملک کوئی نظر آ گیا
تو وہ فرط شادی سے گھبرا گیا

کہ بے شک یہی کشور یار ہے
اسی میں وہ میری طرحدار ہے

وہی سبز پوشیا اس کا تھا غمگسار
اسی سے تھا وہ پوچھتا بار بار

مرے دل کا جائے گا غم کب تلک
سراندیپ پہنچیں گے ہم کب تلک

کبھی وہ گھڑی بھی خدا لائے گا
کہ وہ شہر ہم کو نظر آئے گا

وہ کرتا تھا عرض اب حضور آ گئے
بہت شہر سے اپنے دور آ گئے

غرض ایک دن چند مدت کے بعد
بڑے انتظار اور مصیبت کے بعد

نظر یار کا شہر آنے لگا
جھلک اپنی کچھ کچھ دکھانے لگا

کہا اس سے طوطے نے لو آ گئے
وہ ایام تکلیف و ایذا گئے

کہ اب اٹھ کے شان الٰہی نظر
جو وہ آ رہی ہے سیاہی نظر

یہی قلعہ ہے اس بڑے شہر کا
زمانے میں یہ قلعہ ہے قہر کا

اتارا ہیں فوج و لشکر کا ہے
یہی گھر یہاں ہر دلاور کا ہے

وہ گنبد کلاں جس پہ چمک ہے بہت
وہ جس کے کلس میں جھلک ہے بہت

وہ اک لال جھنڈی کڑی جس پہ ہے
وہ سونے کی چادر پڑی جس پہ ہے

وہ اس شہر کا ہے شوالا بڑا
بلا شک ہے تقدیر والا بڑا

پرستش بڑی اس کی کرتے ہیں لوگ
سر اس بت کے قدموں پہ دھرتے ہیں لوگ

فدا اس پہ ہیں نامی بھی شام بھی
اسے پوجتی ہے وہ گلفام بھی

محل وہ جو ہے سب سے اونچا سوا
مکانوں میں ہے جس کا رتبا سوا

سوا ہر مکاں سے چمک جس میں ہے
وہ سورج کی ایسی جھلک جس میں ہے

وہ جس پر کہ ہے چتر زر جلوہ گر
وہ جس کے ہیں دیوار و در جلوہ گر

یہی قصر ہے اس گل اندام کا
ترے شوخ گلپوش گلفام کا

اسی میں ہے وہ گوہر درج حسن
اسی میں ہے وہ اختر برج حسن

یہی گفتگو تھی کہ پہنچا جہاز
کنارے لگا آ کے ان کا جہاز

جو تھی آرزو دل کی حاصل ہوئی
سفر ہو چکا ختم منزل ہوئی

وہ جوگی سب اس سے اتر کر چلے — سب اس شہر دلکش کے اندر چلے
وہ دلچسپ شہر ان کو آیا نظر — کہ حیراں وہ اسکو ہوئے دیکھکر
حسینان عالم کا مسکن تھا وہ — حسینان گلرو کا گلشن تھا وہ
جدھر دیکھئے مہ جبینوں کا غول — صبیحوں کا جھرمٹ حسینوں کا غول
گزر کسکے دل میں بتوں سا نہ تھا — جو گھر تھا وہ آذر کا بتخانہ تھا
وہ عیار ایمان لین دین لیں — اداؤں سے انسان کا دل چھین لیں
کسیکو جھلک اپنی دکھلا گئیں — کسی کو مہینوں کو ترسا گئیں
کیا اس کو مائل لبھایا اُسے — منھ اس سے چھپایا دکھایا اسے
وہ قاتل کہ جلاد بھی مات تھا — کٹاؤ ان کے کوچے میں ذرات تھا
کبھی ان کو غمزہ فروشی سے کام — کبھی غفلت و چشم پوشی سے کام
ہر اک کی سروہی دو دھاری نظر — چھری بانک برچھی کٹاری نظر
دلوں کے لیے فتنۂ و قہر سب — ستمگار قتالۂ دہر سب !
سراپا کرشمہ، سراپا ادا — کوئی بات ہو اسمیں غمزہ ادا
حسیں دلربا غارت ہوش سب — گل اندام گلفام گل پوش سب
کوئی گلبدن ماہ عالم کوئی — کوئی حور پیکر پری جسم کوئی
جو گھاتیں تھیں ان میں ادائیں بہت — جو باتیں تھیں ان میں جفائیں بہت
کبھی تن گئیں اپنے جوبن کی طرح — کبھی جھک گئیں نیچی چتوں کی طرح
دل اک اک کا سینوں سے لینا انھیں — اور اس کے عوض داد دینا انھیں
جفاؤں سے ان کی پریشاں تھے لوگ — کرشموں سے غمزوں سے حیراں تھے لوگ
انھیں کا انھیں سامنا ہر گھڑی — اور انکے دل تھامنا ہر گھڑی
وہ تھا کون جو محو صورت نہ تھا — کلیجا کسی کا سلامت نہ تھا !
کہیں صید تیر جفا تھا کوئی — کہیں زیر تیغ ادا تھا کوئی !
کہیں تو کسی لب پہ تھی ہائے ہائے — کہیں آہ و فریاد تھی جائے آہ

رتن سین حیراں ہوا اور بھی — وہ کہنے لگا اپنے دل میں یہی
یہاں عام جب حسن ہے اس طرح — تو ہوگی وہ پردہ نشیں کس طرح
صلاح ان کو طوطے نے دی اب یہی — شوالے پہ تم چل کے ٹھہرو ابھی
تمنائے دل ہوگی پوری وہیں — نصیب اس کی ہوگی حضوری وہیں

اب اس کی خبر جا کے کچھ لاؤں میں
جو موقع ہو کچھ اس سے کہہ آؤں میں

پدماوت کا خواب دیکھنا

خدا کے لیے لے خبر ساقیا — عطا اک بھرا جام کر ساقیا
ہوا ہے نیا اک تفکر مجھے — کسی خواب کا ہے تصور مجھے
طبیعت مری کچھ پریشاں سی ہے — مری عقل کچھ آج حیراں سی ہے
تصور ہے مجھ کو اسی خواب کا — برا حال ہے جانِ بے تاب کا
رتن سین کے ہاں پہونچنے کے قبل — کوئی پندرہ بیس روز اس سے قبل
تھی آرام میں پدمنی ایک شب — گئے نیند آنکھیں تھی وہ غنچہ لب
گئی شب جو آدھی گزر خواب میں — تو آیا یہ اس کو نظر خواب میں
کہ دنیا ہے روشن جہاں صاف ہے — شبِ ماہ ہے آسماں صاف ہے
بہت صاف دھویا دھلایا ہوا! — ستاروں سے ہے جگمگایا ہوا
ہر اک سمت پیہم برستا ہے نور — چھما چھم چھما چھم برستا ہے نور
جدھر دیکھیے نور ہی نور ہے — شجر جو ہے بنا سرِ طور ہے
عجب عیش و آرام کی رات ہے — وہ شب ہے شبِ وصل بھی مات ہے
وہ شب ہے کہ دن سے ہے روشن سوا — شبِ قدر سے جلوہ افگن سوا!!
یہ کہتے ہیں ذرے ستارے ہیں ہم — حسینوں کی آنکھوں کے تارے ہیں ہم
سرِ آسماں ہے دماغِ زمیں — مہ چاردہ ہیں چراغِ زمیں

ستاروں سے تابندہ تر سب چراغ
جو ذرے ہیں وہ گوہر شب چراغ

عملداری نور ہے ہر طرف
سیاہی زمانے سے ہے برطرف

فدا ہو رہی ہے چمک ماہ پر
گماں کہکشاں کا ہے ہر راہ پر

چمکتا ہے مہتاب اس شان سے
کہ قربان تارے ہیں سو جان سے

دلوں کو لبھانے کا ڈھنگ اسمیں ہے
حسینوں کے گالوں کا رنگ اسمیں ہے

فلک حسن پر اپنے مغرور ہے
جو تارہ ہے خالِ رخِ حور ہے

چلی آتی ہے روح پرور ہوا
بہت ہلکی ہلکی معطر ہوا

پریشاں نہیں شور و غل سے دماغ
بسے جاتے ہیں بوئے گل سے دماغ

قیامت کا سونا حسینوں کا ہے
ستم اینڈنا نازنینوں کا ہے

ستم ڈھا رہی ہے جوانی کی نیند
وہ مستی بھری شادمانی کی نیند

لگی صاف چادر ہے قالین پر
چنے پھول ہیں کچھ ادھر کچھ اُدھر

گلے میں ہے ہار اک معطر پڑا
دوپٹہ ہے ململ کا منہ پر پڑا

مگر لی ہیں جو کروٹیں ناز سے
تو کچھ ہٹ گیا ہے وہ انداز سے

وہ جوبن جو تنگی سے گھبرائے ہیں
تو انگیا سے کچھ کچھ نکل آئے ہیں

بکھر کر پڑے کچھ ہیں چہرے پر بال
ڈھکے ان سے کچھ پھول سے ہیں وہ گال

مگر بال لپٹے ہیں جو پیار سے
دبے ہیں جو تکیے پہ رخسار سے

تو ظاہر ہیں گالوں پہ سارے نشاں
نظر آتے ہیں پیارے پیارے نشاں

ہوا اس سماں میں سماں اور یہ
بڑھی زینتِ آسماں اور یہ

کہ خورشید مغرب سے تاباں ہوا
بڑے کروفر سے نمایاں ہوا

چلا سوئے مغرب جدھر چاند تھا
بڑھا جس طرف جلوہ گر چاند تھا

ادھر سے چلا چاند بھی شوق میں
گلے اس کے ملنے بڑھا ذوق میں

ہوئے دونوں دست و بغل اسطرح
کہ معشوق عاشق ملیں جس طرح

جو وہ دونوں بچھڑے ہوئے مل چکے — گلے خوب دل کھول کے مل چکے
ذرا ہی سو شرقستاں ہوئے — وہ دونوں نگاہوں سے پنہاں ہوئے
اس اثنا میں وہ نازنیں جاگ اٹھی — وہ مہ پارہ مہر و حسیں جاگ اٹھی
وہ جادو بھری انکھڑیاں کھل گئیں — وہ فتنے کی دو کھڑکیاں کھل گئیں
مگر وہ سماں دل میں چھپایا ہوا — وہ عالم نظر میں سمایا ہوا!
وہی عالم نور پیش نظر — وہی جلوۂ طور پیش نظر
وہی سین آنکھوں کے اب روبرو — نظر آرہے تھے وہی چار سو
نہ پھر نیند اسدم سے آئی اسے — وہی نور دیتے دکھائی اسے
پریشاں کہ اب جلد ہو جائے صبح — کسی طرح منھ اپنا دکھلائے صبح
خواصوں سے یہ خواب اپنا کہوں — کسی طرح ان سے یہ قصا کہوں
دکھائی دئیے بارے آثار صبح — شگفتہ لگا ہونے گلزار صبح
چلی رات عالم سے پو پھٹ چلی — سیاہی جو پھیلی تھی وہ ہٹ چلی
لگا فرق آنے شب تار میں — خزاں آ گئی شب کے گلزار میں
صبا بس کے پھولوں میں چلنے لگی — وہ پھر عطر کپڑوں میں ملنے لگی
چلی اڑ کے ہر سو شمیم چمن — لگی رقص کرنے نسیم چمن
ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں — گلستاں میں چڑیاں چہکنے لگیں
چلے لوگ، چپ پہرے والے ہوئے — پھر آباد مندر شوالے ہوئے
صدائیں اذانوں کی بھی آ چلیں — عبادت گزاروں کو چونکا چلیں
اٹھیں حسن کی دیویاں ناز سے — ہوئیں زیب فرش ایک انداز سے
جو منجن مسی سے فراغت ہوئی — تو پھر خواہش زیب و زینت ہوئی
منھ آئینہ میں دیکھا بھالا گیا — دوپٹہ وہ سر پہ سنبھالا گیا
گلوری پھر اچھی بنائی گئی! — وہ اک گال میں پھر دبائی گئی
اٹھی وہ حسیں بستر ناز سے!! — گئی فرش پہ بیٹھ انداز سے

خواصیں بھی سب اُٹھ کے حاضر ہوئیں — وہ پھر جمع خدمت کی خاطر ہوئیں
دم اس کی اطاعت کا بھرنے لگیں — یہ اس حور سے عرض کرنے لگیں
کہ سرکار اٹھیں سویرے یہ کیوں — گئی آنکھ کھل منھ اندھیرے یہ کیوں
بیاں اس نے وہ حال اپنا کیا — عیاں ان پہ شب کا وہ قصا کیا
یہ خواب اس کا سنکر ہوئیں شاد سب — یہ کہنے لگیں وہ پریزاد سب !!
کہ سرکار نے خواب دیکھا ہے کیا — بہت ہی مبارک ہے خواب آج کا
یہ اُلفت کی تاثیر ہے اے حضور — یہی اس کی تعبیر ہے اے حضور
کہ پورب سے کوئی جواں آئے گا — وہ سرکار کو بیاہ لے جائے گا
وہ خورشید ہے ماہ سرکار ہیں — وہ تارے جو تھے ہم پرستار ہیں
اسی کی یہ پہلے سے تاثیر ہے — یہی ٹھیک ٹھیک اس کی تعبیر ہے
یہ سُن کر لگی ہنسنے وہ مہ لقا — اور ان سب سے اس نے یہ ہنس کر کہا

کہیں شامتیں تو نہیں آگئیں
یہ بھنگ آج تو تم نہیں کھا گئیں

توتے کا پدماوت کے پاس جاکر رتن سین کا حال بیان کرنا

کہاں ہے تو ساقی خفا ہو کے ہائے — یہ بیگانگی آشنا ہو کے ہائے !!
ہوئی دو ہی دن میں یہ حالت تری — گئی وہ کہاں اگلی اُلفت تری
تغافل یہ دو بوند مے کے لئے — رکھائی یہ تھوڑی سی شے کے لئے
جو سمجھا کے اس کو وہ توتا اُڑا — تو اس حور کی سمت سیدھا اڑا
گیا اسکے بام فضا بار پر — گیا بیٹھ کمرے کی دیوار پر
وہاں سے جو اس نے بڑھائی نظر — تو تنہا وہ کمرے میں آئی نظر!
اکیلی ہی وہ بھول تھی اس گھڑی — سنگاروں میں مشغول تھی اس گھڑی
لگا تھا بڑا آئینا سامنے — سجا عطر داں تھا دھرا سامنے

اور اپنے وہ کھولے ہوئے بال تھی — زمیں پر بچھائے ہوئے جال تھی
وہ بالوں میں کنگھی تھی خود کر رہی — سجاوٹ کا اپنی تھی دم بھر رہی
وہ زلف اپنی چھل بل تھی دکھلا رہی — بڑا قہر اس وقت تھی ڈھا رہی
کبھی بڑھ کے تکیے تلک آ گئی — اتر کر کبھی فرش پر چھا گئی
کبھی رخ پہ بکھری کبھی دوش پر — کبھی بولی سنبل ہے پاپوش پر
بلائیں کبھی روئے روشن کی لیں — بلائیں کبھی گوری گردن کی لیں
جوانی کا وہ حسن تھا جوش پر — دوپٹا تھا سر سے ڈھلا دوش پر
عجب اس گھڑی حسن پر گال تھے — سوا چاند سے جلوہ گر گال تھے
تمام ان کا پھیلا ہوا نور تھا — وہ کمرہ بھی غیرت وہ طور تھا
نہ ہٹتی تھی آئینے پر سے نظر — اٹھاتی نہ تھی وہ ادھر سے نظر
وہ خود شیفتہ اپنی صورت پہ تھی — وہ حیران خالق کی قدرت پہ تھی
اڑا واں سے الفت کے وہ جوش میں — گرا آ کے اس بت کے آغوش میں
وہ حیرت سے منہ اس کا تکنے لگی — جھجک کر دوپٹا جھٹکنے لگی
ڈری اس کو وہ اجنبی جان کر — ہنسی بعد اس کے وہ پہچان کر
کہا تھا ارے بے مروت کہاں — رہا جا کے تو اتنی مدت کہاں
یہ بلی کے منہ سے بچا کس طرح — بتا تو یہ زندہ رہا کس طرح
پرندے نے اپنا فسانہ کہا — وہ حال جفائے زمانہ کہا
کنیزک کی ساری حقیقت کہی — کنوئیں کی وہ اپنی مصیبت کہی
وہ تھوڑا سا صیاد دشمن کا حال — وہ چتوڑ گڑھ کے برہمن کا حال
وہ راجہ کی الفت محبت کا ذکر — وہ اسدن کی رانی کی نخوت کا ذکر
وہ تقریر اپنی جلال اس کا وہ — خیال اس کا وہ انفعال اسکا وہ
وہ دھو بیٹھنا ہاتھ جی جان سے — وہ بچنا کنیزک کے احسان سے
یہ کہہ کر کہا اب مناسب نہیں — مفصل بیاں اس کا واجب نہیں

وہ حیرت میں قصہ یہ سن کر ہوئی — سب احوال سننے کو مضطر ہوئی
کہا کیوں مناسب نہیں کس لیے — بیان اس کا واجب نہیں کس لیے
بتا تو پھر آگے ہوا اس کے کیا — ملا تو تو راجہ سے پھر کیا کہا
کہا اس نے کہئے بیاں کیا کروں — بیاں کس زباں سے یہ قصا کروں
ترا نام لینا غضب ہو گیا — وہ دل تھام کر جاں بلب ہو گیا
ہر اک چیز سے اس کا دل ہٹ گیا — جگر کی طرح غم سے دل پھٹ گیا
وہ اتنی بڑی سلطنت چھوڑ دی ! — دیا چھوڑ گھر مملکت چھوڑ دی
وہ اچھا بھلا غم کا روگی بنا — ترا نام لے کر وہ جوگی بنا !
ہوا چل کھڑا اپنا گھر چھوڑ کر — پیادہ چلا سب کا دل توڑ کر
سفر کی مصیبت اٹھاتا ہوا — نئی چوٹ ہر روز کھاتا ہوا
مرے ساتھ ہے آج پہنچا یہاں — شوالے پہ ٹھہرا ہے وہ نیم جاں
جو اس نے یہ سارا فسانا سنا — اور اس کا سراندیپ آنا سنا
تو وہ غیرت حور گھبرا گئی — جگر پر لگی چوٹ تھرا گئی !
مگر رہ گئی چپ وہ دل تھام کر — لگی سوچنے دل میں وہ سیمبر
کہ سچ خواب کی تھی وہ تعبیر کیا — ہوئی ظاہر اس سے یہ تاثیر کیا
مرا دل تو سنکر ٹھکانے نہیں — کھنچی آتی ہے لب پہ جان حزیں
گئی ٹال پر صاف وہ مہ لقا — وہ حال اس نے گویا سنا ہی نہ تھا
کہا خیر اب تو نہ جانا کہیں — مرے پاس ہر وقت رہنا یہیں
یہ کہہ کر لیا پھر جھکا اپنا سر — لگی حال پر اپنے کرنے نظر
لگا جوش غم میں غش آنے سے — مگر کچھ سنبھالا حیا نے اسے
نئی بات اُسے دل سوجھانے لگا — غم اٹھ اٹھ کے دل کو بٹھانے لگا
ہنسی نے لبوں سے کنارا کیا — تڑپ نے جگر پارا پارا کیا
قلق نے گلے سے لگایا اسے — سرشک الم نے بہایا اُسے

زمیں کی طرف پھٹ کے داماں چلا — نکل کر گلے سے گریباں چلا
کلیجے کو غم گدگدانے لگا — تڑپ کر جگر منھ کو آنے لگا
گرانباری جان بسمل بڑھی — گھٹا زور بیتابئ دل بڑھی
تمنائے دل جوش کھانے لگی — طبیعت کی وحشت ستانے لگی
نئی دل میں پیدا ہوئی آرزو — یہی دل سے کرنے لگی گفتگو
مرے واسطے اس نے چھوڑا مکاں — مری ہی محبت میں آیا یہاں
مرے ہی لیئے جوگ اس نے لیا — مرے عشق کا روگ اس نے لیا
دکھاؤں کسے جا کے دل کی یہ چوٹ — لڑکپن میں پہلے پہل کی یہ چوٹ
اسی سے تھی کچھ دن سے وحشت مجھے — اسی سے تھی ہر شئے سے نفرت مجھے
کھلا جا کے اب تو یہ اسرار تھے — اسی غم کے پہلے سے آثار تھے
کٹیں گے یہ دن غم کے اب کسطرح — بسر ہوگی غم کی یہ شب کسطرح
جو ماں گھر میں دیکھے گی حالت مری — یہ بیمار کی طرح صورت مری
تو وہ ہائے پھر کتنی گھبرائے گی — بہت اس کو تشویش تڑپائے گی
جو پوچھے گی تو میں بتاؤں گی کیا — بھلا اس سے باتیں بناؤں گی کیا
خواصوں سے بھی مجکو خفت ہوئی — اب اک اک سے مجکو ندامت ہوئی
اسی غور میں وہ سمن بر پڑی — بڑھی اس کی تشویش الجھن بڑھی
مگر اس کو دل میں چھپائے ہوئے — بہت اپنی صورت بنائے ہوئے
سوجھاتا یہی گرچہ اس کا خیال — کہ کچھ اور بھی پوچھے توتے سے حال
مگر شرم ہوتی تھی مہر وہاں — وہ پھر تھام لیتی تھی اپنی زباں
نہ کچھ گرچہ توتے سے اس نے کہا — مگر اس پہ احوال سب کھل گیا
کہ پہونچا بہت دل پہ اس کے اثر — چھپاتی ہے پر مجھ سے یہ سیم بر
یہی اس نے اس حور کا ماجرا — رتن سین سے جا کے سارا کہا
اب اور اس کے دل کا بڑھا اشتیاق — لگا اس کو تڑپانے دردِ فراق

سوا اور اب جوشِ سودا ہوا
یہ سینے میں دل کا تقاضا ہوا

کہ رہتے نہیں اب تو پہلو میں ہم
رہیں گے اسی بت کے گیسو میں ہم

ہوا دونوں آنکھوں کا اصرار یہ
لگیں کہنے اس سے وہ خونبار یہ

ہمیں اک نظر اب دکھا دیجئے
بصارت کی ہمکو دوا دیجئے

لگے کہنے ہاتھ اب تو ہم دیں گے ہم
بلائیں رُخِ یار کی لیں گے ہم

ادھر ہاتھ کی آرزو اس طرح
ادھر جان کی گفتگو اس طرح

کہ پورا اب ارمان کر دیجئے
ہمیں چل کے قربان کر دیجئے

کہا اس نے توتے سے اے غمگسار
مرے دوست سچے مرے غمگسار

مرا نامہ تو لے کے جاتا اگر
جواب اس کا اس بت سے لاتا اگر

تو ہوجاتی تسکین پوری مجھے
ستاتی نہ یہ ناصبوری مجھے

ہوا مستعد وہ کہا اس طرح
خط اس بت کو اس نے لکھا اس طرح

رتن سین کا خط

یہ لکھا کہ اے نازنین جہاں
صبیح زمانہ، حسین جہاں

غریب اک مسافر بہت دور کا
تمہارے ہی کارجھٹ میں آکر ٹکا

خبر اس کی ہے تم کو لینا ضرور
اسے اپنا درشن ہے دینا ضرور

ہوئی دیر اس میں تو پچھتاؤ گی
اُسے پھر نہ تم دیکھنے پاؤ گی

اب آگے لکھوں کیا بیانِ الم
بہت طول ہے داستانِ الم

تمہارے بغیر اب گزرتی نہیں
جو دن کٹ گیا شب گزرتی نہیں

شبِ غم کی کچھ انتہا ہی نہیں
پلک سے پلک آشنا ہی نہیں

مرا دل پریشان ہے ہر گھڑی
تمہیں ہی پتی جانتا ہے ہر گھڑی

تمہیں اپنی بانکی نظر کی قسم
تمہیں اپنی پتلی کمر کی قسم!

قسم تم کو چشمِ فسوں ساز کی
قسم ہے تمہیں ناز و انداز کی

قسم تم کو ان گل سے گالوں کی ہے — قسم تم کو ان لمبے بالوں کی ہے
کہ اب تم نہ اتنا رلاؤ مجھے — کسی طرح صورت دکھاؤ مجھے
جھلک دیکھ لیتا تمہاری اگر — ذرا یاں تک آتی سواری اگر
تو رہتا نہ یہ اشکباری کا روگ — ستاتا نہ یہ بیقراری کا روگ
مٹائے خدا یہ ملالِ فراق — زیادہ لکھوں کیا بجز اشتیاق
جو وہ آرزو مند خط لکھ چکا — کیا ختم مطلب فقط لکھ چکا
تو وہ چونچ میں خط کو لیکر اُڑا — سوئے بام قصر منور اُڑا !
وہ خط اسکو موقع سے آکر دیا — اکیلے میں وہ غم کا دفتر دیا
وہ حیرت میں آئی اسے دیکھ کر — لگی کھول کر پڑھنے وہ سیمبر
پڑھا تو وہ مضمون اس پر کھلا — ہوئی اور بے چین وہ دلربا
یہی اس نے توتے سے لیکن کہا — کہ تو کیوں یہ لایا ہے خط غیر کا
کھلے گر محل میں کسی پر یہ حال — تو کیا میری نسبت کرے وہ خیال
مگر خیر اب تو ہوا جو ہوا ! — یہ تجھ سے تو ہو ہی گئی ہے خطا
لکھے دیتی ہوں میں ابھی اسکا جواب — مرے واسطے کیوں ہو کوئی خراب
غرض بیٹھی لکھنے جواب اسکا وہ — چلی لکھنے حال خراب اپنا وہ

پدماوت کا خط

پڑی سوچ میں لکھوں القاب کیا — میں اس کے لیے ڈھونڈوں آداب کیا
لکھوں اس کو راجہ کہ جوگی لکھوں — کہ اُلفت کا بیمار روگی لکھوں
جو لکھتی ہوں عاشق مناسب نہیں — جو مشتاق لکھتی ہوں واجب نہیں
دیا لکھ کے کاٹ اس کو اے مہرباں — کیا چاک خط لکھ کے اے قدرداں
کوئی رائے اس وقت بھاتی نہ تھی — مناسب کوئی لفظ پاتی نہ تھی !!
لکھا آخر اے طالب بیقرار — مرے حسن نادیدہ کے خواستگار !

مرے حسن کی چوٹ کھائے ہوئے — مری زلف میں دل پھنسائے ہوئے
مری شہرت دلبری کے شہید — مری آنکھ جادو بھری کے شہید
جو خط تم نے لکھا وہ مجھ کو ملا — کروں اپنے توتے کا میں کیا گلا
یہ کیوں مجھ پہ تم شیفتا ہو گئے — یہ نادیدہ کیوں مبتلا ہو گئے
تمہیں کہنے سننے میں جانا نہ تھا — پرندے کی باتوں میں آنا نہ تھا
خبر اس نے تم کو یہ دی ہے غلط — مری اس نے تعریف کی ہے غلط
مری شکل وصورت تو اچھی نہیں — اجی جھوٹ ہے سچ یہ کچھ بھی نہیں
مرے واسطے جوگ لینا نہ تھا — مرے دل پہ یہ داغ دینا نہ تھا
کچھ اچھا نہ یہ کام تم نے کیا — مجھے مفت بدنام تم نے کیا
برا سب مرضوں سے ہے الفت کا روگ — نہ دشمن کو بھی ہو محبت کا روگ
کسی کو کسی سے ہے الفت اگر — بناوٹ کا اس میں نہیں ہے اثر
تو ممکن نہیں ہے اثر کچھ نہ ہو — اسے اس کے دل کی خبر کچھ نہ ہو
قرار و سکون دل سے جاتے ہیں بھاگ — دو طرفہ لگی رہتی ہے دل میں آگ
مرا بھی اب احوال اچھا نہیں — مری زندگی کا بھروسہ نہیں
وہ لطف اپنی راحت کا جاتا رہا — وہ شغل اپنی زینت کا جاتا رہا
جن آنکھوں میں رہتا تھا فتنا بھرا — انھیں میں ہے اشکوں کا دریا بھرا
وہ زلفیں بھی کالی بلا اب نہیں — وہ پہلی سی تیغ ادا اب نہیں
نہ کھانے نہ پینے نہ سونے سے کام — اگر ہے تو چھپ چھپ کے رونے سے کام
زیادہ بیان الم کیا لکھوں! — شب و روز کا رنج کیا لکھوں

یہ لکھ کر وہ پڑھنے لگی اپنا خط — کہ لکھ تو نہیں میں گئی کچھ غلط
پڑھا تو بہت اس کو آئی حیا — کہ میں اس کو کیا لکھ رہی ہوں یہ کیا
یہ میرے لیے تو کچھ اچھا نہیں — شریفوں کو یہ بات زیبا نہیں

نہیں ہے مرے یہ تو عصمت کی بات — بہت ہی کہا ہے یہ شرم و غیرت کی بات

انھیں ساری باتوں پہ کر کے نظر — دیا اس نے پھینک اپنا خط پھاڑ کر

کہا اب جو جاتا ہو تیرا ادھر — تو کہنا کہا ہے یہ خط دیکھ کر

بسنت آ کے پہونچا ہے نزدیک اب — مرا واں جو آنا ہو تو کیا عجب

یہی کہہ کے رخصت اسے کر دیا — اور اس نے ادھر ہی کا رستا لیا

ادھر تو وہ توتا روانہ ہوا — ادھر درد سر کا بہانہ ہوا

گری بستر ناز پر بے قرار — ہوا مضطرب دل جگر بے قرار

لگی لوٹنے مرغ بسمل کی طرح — تڑپنے پھڑکنے لگی دل کی طرح

بڑا غم بڑا رنج دل پر ہوا — جگر صورت اشک مضطر ہوا

چھٹا اس کا آرام کھانا چھٹا — وہ لوگوں کے پاس آنا جانا چھٹا

ہوئی گھل کے حد سے سوا زار وہ — ہوئی سوکھ کر پھول سے خار وہ

یہاں تو یہ اس بت کا احوال تھا — وہاں یہ رتن سین کا حال تھا

کہ توتے کا تھا منتظر دیر سے — تڑپتا تھا وہ منتشر دیر سے

نظر اس کی دیوار و در پہ کبھی — کبھی دہنے بائیں شجر پر کبھی

کبھی بیٹھ جاتا ٹہلتا کبھی — تردد میں ہاتھوں کو ملتا کبھی

وہ توتا اس اثنا میں ظاہر ہوا — وہ ہدہد سلیماں کا حاضر ہوا

کہا آ کے پیغام بلقیس کا — کہا ماہ سے حال برجیس کا

کیا اس کو امیدوار بسنت
وہ کرنے لگا انتظار بسنت

بسنت کے دن پدماوت کا پوجے کیلئے مندر جانا

کدھر جا کے تو ساقیا چھا گیا — خبر تجکو ہے کیوں بسنت آ گیا

وہ سن غل ہے ہر سو پھر آیا بسنت — خوشی پھر بڑی ساتھ لایا بسنت

گئے دن پھر آئے پھر آم آ چلے — بہار اپنی عالم کو دکھلا چلے
شجر ہو گئے سب خوشی سے نہال — ہوئے دشت و کہسار ٹیسو سے لال
ہوئی صبح اس دن کی جب جلوہ گر — چلی گھر سے مندر کو وہ سیم بر
شوالے کو اس کی سواری چلی — کہ گلشن کو بادِ بہاری چلی
بڑے ٹھاٹھ سے وہ سمن بر چلی — خواصوں کو سب اپنی لیکر چلی
شوالے سے سب لوگ اٹھائے گئے — ہر اک راستے سے ہٹائے گئے
مگر وہ دل افگار اندوہگیں — رہا بیٹھ کچھ ہٹ کے واں سے کہیں
شوالے کے وہ حور جا کر قریب — اداؤں سے تشریف لا کر قریب
اتر کر خراماں خراماں چلی — لئے سیکڑوں دل میں ارماں چلی
چلی بڑھ کے شیریں سوے کوہ کن — چلی شوق میں نل سے ملنے دمن
زیارت کو وامق کے عذرا چلی — گولے ملنے مجنوں سے لیلےٰ چلی
چلی ہنستی بادِ سحر کی طرح — چلی اپنی تیغِ نظر کی طرح
وہ ناگن سے چوٹی لٹکتی ہوئی — وہ آنکھوں سے مستی ٹپکتی ہوئی
گلے میں وہ جوڑا بسنتی پڑا — کہ اس فصل میں اسکا شہرہ بڑا
کہیں تو کڑے سے کڑے لڑ گئے — کہیں کھا کے ٹھوکر چھڑے لڑ گئے
کہیں بج کے گھنگرو نے بیداد کی — کہیں لٹ کے چھاگل نے فریاد کی
وہ انداز پیارا وہ رفتار مست — نظر مست چشم فسونکار مست
خواصیں کنیزیں طرحدار سب — شراب جوانی سے سرشار سب
نہ پاؤں ان کا اٹھ کر جگہ پر پڑا — دھرا یاں، وہاں وہ بہک کر پڑا
ہر اک شوخ کی وضع پیاری وہی — بدن میں سجی زردساری وہی
وہ ڈوبی تھیں سب ایک ہی رنگ میں — فسونکار چالاک ہر ڈھنگ میں
پریزاد و نازک حسیں سب کی سب — گل اندام زہرہ جبیں سب کی سب
کوئی گلبدن، ماہ پارا کوئی — کوئی چاند اس میں ستارا کوئی

ہر انداز میں سیکڑوں ناز تھے
ہر اک ناز میں لاکھوں انداز تھے

اسی طرح پہنچی وہ مندر تلک
گئی اس شوالے کی قسمت چمک

پہونچتے ہی مندر کے اندر گئی
وہ بجلی سی اس میں چمک کر گئی

وہ بت بھی ہوا محو ہو کر فدا
یہ بے ساختہ اس سے آئی صدا

نہیں شک کہ یکتا ہے صورت میں تو
نہیں مثل رکھتی صباحت میں تو

نہیں کوئی دنیا میں ہمسر ترا
زمانے میں اے حور پیکر ترا

غرض تھوڑی دیر اس نے پوجا کیا
جو مانی تھی کی اپنی منت ادا

چلیں واں سے وہ ایک اندر کو پھر
اسی سمت بیٹھا تھا وہ منتظر

وہ بیٹھا تھا آسن جمائے ہوئے
اسی شمع پر لو لگائے ہوئے

جب اس حور سے سامنا ہو گیا
تو دشوار دل تھامنا ہو گیا

وہ مستانہ چال اس کا دل مل گئی
کلیجے پہ تیغ نظر چل گئی

لگا زخم ایسا دل چاک پر
کہ بیہوش ہو کر گرا خاک پر

ہوا سب پہ ثابت کہ یہ مر گیا
جہاں سے پرارمان سفر کر گیا

مگر حسن اس کا بھی آفت کا تھا
فقیری میں جوبن قیامت کا تھا

ہوئی لوٹ اس پر وہ گلپوش بھی
اڑے اس پری زاد کے ہوش بھی

گئی وہ سمجھ ہے یہ شیدا وہی
یہ دھونی رمائے ہے بیٹھا وہی

غش آخر وہ مہ رو بھی کھانے لگی
زمیں کی طرف جھک کے جانے لگی

سنبھالا خواصوں نے مل کر اسے
بٹھا کر وہیں پھر زمیں پر اسے

بلائیں وہ سب اس کی لینے لگیں
ہوا اس کو آنچل کی دینے لگیں

جو کچھ دیر میں بیخودی کم ہوئی
گیا غش وہ خود رفتگی کم ہوئی

تو شرمائی ان جاں نثاروں سے وہ
یہ کہنے لگی غمگساروں سے وہ

کہ گرمی مرے دل پہ تھی چھا گئی
جو لذت یہ اسدم مری آ گئی

مگر اب ہے اچھی طبیعت مری
نہیں غیر اب ویسی حالت مری

وہ کہنے لگیں یہ کبھی تھی کیا گھڑی — خدا جانے گرمی یہ کیوں پھٹ پڑی
گئی اس طرف یوں گزر آپ پر — مگر اکہا کے یوں غش وہ ہو گئی ادھر
اور ایسا گرا ہے وہ دل تھام کر — تعجب نہیں جو گیا ہو گزر
وہ بولی کہ دیکھو تو چل کر ذرا — فقیروں کی خدمت ہے کرنا روا
یہ سن کر وہ سب پاس اسکے گئیں — جو صندل لئے تھیں سنگھانے لگیں
مگر تھا وہ یوں چوٹ کھا کر گرا — گیا ہوش اس کا نہ اسدم پھرا
وہ افسوس سب اس کا کرنے لگیں — دم اسکی وہ صورت کا بھرنے لگیں
کسی کو اب اس کی خبر کیا وہاں — کہ یہ راز دونوں کے ہے درمیاں
بہت ہی ہوئی وہ حسیں بدحواس — گئی بیٹھ اپنے وہ کشتے کے پاس
کبھی غش کی حالت جو دیکھی نہ تھی — یہ آنکھوں سے صورت جو دیکھی نہ تھی
تو اشک اس کی آنکھوں سے آئے نکل — محبت نے اس کا دیا دل مسل
وہ آخر کو کچھ رہ کے واں منتظر — لگیں کہنے اک دوسرے سے وہ پھر
کہ اب دیر کرنا مناسب نہیں — ٹھہرنا یہاں ہمکو واجب نہیں
نہ ضبط اس حسینہ سے اب ہو سکا — یہ صندل سے سینے پہ اس کے لکھا
لیا جوگ پر لے نہ آیا تمہیں — کسی نے نہ اب تک سکھایا تمہیں
یہ انگلی سے سینے پہ لکھ کر چلی — بہت ہی پریشان مضطر چلی

گئی پھر نہ وہ اس جگہ سے کہیں
پلٹ آئی گھر اپنے وہ نازنیں

پدماوت کے چلے جانے کے بعد رتن سین کا ہوش میں آنا

پہونچ جلد ساقی کہ مرتا ہوں میں — دم سرد فرقت میں بھرتا ہوں میں
مجھے دخت رز آ کے تڑپا گئی — جگر کو لگا ہوں سے برما گئی
دیا داغ دل اس نے میرا لیا — پیالے دے کے ظالم نے رسوا کیا

مرا دل وہ رشکِ قمر لے گئی
اور اس کے عوض غم مجھے دے گئی

وہ بجلی چمک کر نہاں ہو گئی
خدا جانے غائب کہاں ہو گئی

جو وہ مست خمخانۂ بیخودی
وہ سرشار پیمانۂ بیخودی

وہی پدمنی نازنیں کا فقیر
وہی اس کی زلفِ دوتا کا اسیر

سرِ خاک وہ کچھ سنبھل کر اٹھا
دھرے ہاتھ اپنے جگر پر اٹھا

تو دیکھا کہ غائب وہ گلپوش سا ہے
وہ بجلی کی تصویر روپوش ہے

نہ وہ چاندنی ہے نہ تارے ہیں وہ
نہ شعلہ نہ اسکے شرارے ہیں وہ

وہی میں وہی بسترِ خاک ہے
وہی آرزوئے دلِ چاک ہے

مجھے پھر ہے گھیرے تباہی وہی
تردد میں بیٹھے ہیں ساتھی وہی

یہ حالت جو دیکھی تو گھبرا گیا
ہوا غم وہ منہ کو جگر آ گیا

جو تحریر سینے کی آئی نظر!
لہو غم سے رونے لگی چشمِ تر

وہی اس کی تصویر آگے کھڑی
یہی دل سے اب گفتگو پر کھڑی

مرے سامنے وہ حسیں آئی کیوں
مجھے شکل اپنی یہ دکھلائی کیوں

جو یوں جلد جانا تھا آنا نہ تھا
جھلک مجھکو اپنی دکھانا نہ تھا

مجھے چین اب آئے تو کس طرح
جو تسکین دل پائے تو کس طرح

پریشان وہ آخر ہوا اس قدر
کہ جلتی جو واں آگ آئی نظر

تو چاہا کہ ہو جاؤں جل کر ہلاک
مٹا دوں یہ جھگڑا ہی میں ہو کے خاک

لیا ساتھیوں نے مگر اس کو تھام
نہ طے ہونے پایا جنوں کا وہ کام

اب اٹھا وہاں سے جو وہ بدحواس
تو پہونچا مہاراج کے جا کے پاس

مگر ساتھ ہی اس کے ساتھی گئے
کہ پہونچے کہیں کچھ نہ صدمہ اسے

وہ حیران اس کو ہوا دیکھ کر!
کہ آیا نہیں یوں جواں ایسا نظر

خدا جانے کس باغ کا پھول ہے
عجب دلکشا خوشنما پھول ہے

کہا اس سے تم کو ضرورت ہے کیا
بتاؤ تمہیں مجھ سے حاجت ہے کیا

کہا اس نے کچھ ہم کو حاجت نہیں　　کسی شے کی ہمکو ضرورت نہیں

تمنا ہے پدماوتی کی ہمیں　　جہاں میں ہے حاجت اسی کی ہمیں

وہی رشک خورشید ہم کو ملے　　وہی دل کی اُمید ہم کو ملے

یہ سُنکر وہ غصّے سے تھرا گیا　　زباں پہ وہیں حکم قتل آ گیا

دیا حکم ہوں سب کے سب زیر تیغ　　یہ بیباک یہ بے ادب زیر تیغ

وزیروں نے لیکن بچایا انھیں　　کیا کم وہ غصّہ ہٹایا انھیں

پلٹ آئے ناکام سب پھر وہیں　　لگا جان کھونے وہ اب پھر وہیں

ہوئی رات تو کام اب یہ کیا　　گئی شب گزر نصف سے جب سوا

تو سوئے محل اب وہ مضطر چلا　　رفیقوں کو ہمراہ لیکر چلا

وہاں گو تھا یہ قہر گرد محل　　کہ جاری تھی اک نہر گرد محل

کوئی پار اتر جائے ممکن نہ تھا　　کہیں سے گزر جائے ممکن نہ تھا

مگر پہونچے وہ نہر پہ تیر کر　　ہوا مستعد اب وہ خستہ جگر

کہ پھینکوں کمند اس کے میں قصر پہ　　پہونچ جاؤں اوپر اسے تھام کر

ملوں جا کے اس برق رخسار سے　　مشرف ہوں میں اسکے دیدار سے

اس اثنا میں لیکن سحر ہو گئی　　سیاہی ہی شب بسر ہو گئی

چلی توپ سب پاسباں جاگ اُٹھے　　مقرر تھے جو جو وہاں جاگ اٹھے

وہ سب دیکھ کر ان کو گھبرا گئے　　کہ اتنے کہاں سے یہ چور آ گئے

وہ مجبور ناچار سب ہو گئے　　اسی دم گرفتار سب ہو گئے

ارادہ تو یہ ساتھیوں نے کیا　　کہ لڑ کر چکھا دیں ہم ان کو مزا

ہم ان سب کے تیغ و تبر چھین لیں　　یہ گرز و سنان و تبر چھین لیں

مگر اس نے روکا کہ واجب نہیں　　ہمیں ان سے لڑنا مناسب نہیں

یہ قصر مبارک ہے دلدار کا　　یہ کوچہ ہے پیارے مرے یار کا

فدا اس پہ میں جان میری فدا　　مرے ساتھ ہو جاؤ تم بھی فدا

ہوا حال راجہ پہ جب یہ عیاں — دیا حکم ان کو نہ اب دو اماں
سزا ان کو پھانسی کی دیجائے اب — نہ ان میں سے مہلت کوئی پائے اب
یہ دیکھا تو توتا ہراساں ہوا — بہت اپنے دل میں پریشاں ہوا
مہاراج کے پاس اڑ کر گیا — کہا اس سے تو قہر کرتا ہے کیا
سپہدار چتوڑ گڑھ کا ہے یہ — یہ جوگی نہیں حکم فرما ہے یہ
جو یہ اس طرح آرہا ہے نظر — محبت کا ہے پدمنی کی اثر
اسی کے لیے یہ ہوا ہے فقیر — ہوا ہے اسی کی بدولت اسیر
یہ توتے سے سنکر اڑے اس کے ہوش — یہ مجھ سے یہ کہتا ہے کیا سبز پوش
کہا سب نے اس کا بیاں ٹھیک ہے — جو کہتا ہے یہ سبز باں ٹھیک ہے
گدا کی بھلا ایسی صورت کہاں — یہ ہمت یہ جرأت یہ شوکت کہاں
معاً پاس سب وہ بلائے گئے — بڑی آبرو سے بٹھائے گئے
بڑے لطف سے ان کو مہماں کیا — بڑا ان کی دعوت کا ساماں کیا
بڑی قدر کی اور محبت بڑی — بڑی معذرت کی عنایت بڑی
مگر امتحاں بھی یہ اس کا لیا — کہ گھوڑے پہ چڑھنے کا فرماں دیا
وہ گھوڑا منگایا جو منہ زور تھا — شرارت کا اس کی بڑا شور تھا
کوئی اس کے نزدیک آتا نہ تھا — ادھر سے کوئی ہو کے جاتا نہ تھا
ہوا کا تو جھونکا وہ صحرا میں تھا — گھٹا کوہ پر موج دریا میں تھا
جو جاتا تو اڑتا خبر کی طرح — پلٹتا تو آتا نظر کی طرح
سوار اس پہ وہ جا کے ایسا ہوا — سواری ہی میں اس کی گویا وہ تھا
پھرا کر بھگا کر تھکا کر اسے — کھڑا کر دیا آگے لاکر اسے
اب اس کو کوئی شک نہ باقی رہا — ہوا شاد دل میں وہ حد سے سوا
ہوئے خوش ارکین دولت بہت — ہوئی سب کو حاصل مسرت بہت
ہوئی پدمنی کو بہت ہی خوشی — کہ جان اپنی وہ دیتی دیتی بچی

رتن سین کا وہ یہ سب سن کے حال! — یہ ٹھانے تھی دل میں وہ زہرہ مثال
ملے گی جو مرنے کی اسکے خبر — تو کر دوں گی میں بھی عدم کا سفر

اُسے یا تو اپنا بنا لوں گی میں
وگرنہ ابھی زہر کھا لوں گی میں

پدماوت کے ساتھ رتن سین کی شادی

یہ کیوں میکدے میں ہے غل شور آج — خوشی کا ہے ساقی یہ کیوں زور آج
یہ کیوں رقص کرتا ہے جام اس قدر — بنا کب سے ہے میکدہ ناچ گھر
لگن دخت رز کی پڑی کب سے ہے — خوشی کی یہ آئی گھڑی کب سے ہے
یہ دن تو بڑے جوش عشرت کا ہے — زمانہ خوشی کا مسرت کا ہے
مبارک کرے بیاہ واللہ یہ — رہیں خوش دلہن اور نوشاہ یہ
وہ راجہ اس اثنا میں اندر گیا — خبر اسکے آنے کی لے کر گیا
کہا جا کے رانی سے احوال وہ — بتایا رتن سین کا حال وہ
کہا پھر نہ پائیں گے گھر اس طرح — ملے گا نہ ڈھونڈھے سے بر اس طرح
وہ بولی کہ پھر اس میں عرصہ ہی کیا — لگن کے دھرانے میں وقفہ ہے کیا
کرو جلد شادی کی تدبیر تم — نہ رکھو روا اس میں تاخیر تم
یہ سن کر ہوئی اور عجلت اسے — رہی پھر نہ شورے کی حاجت اسے
کیا اس نے سب پنڈتوں کو طلب — لگن پڑ گئی لطف کے ساتھ اب
خوشی کی بجیں نوبتیں ہر طرف — غم و رنج دل سے ہوئے برطرف
وہ گلپوش ماتھے بٹھائی گئی!! — نظر سے چھپائی چھپرائی گئی
عجب وہ بھی دلکش تھی دنیا میں رات — کہ جس شب کو تھی آنیوالی برات
جدھر دیکھئے روشنی نور کی — ہر اک بام پر روشنی طور کی!
حویلی سے نوشاہ کے گھر تلک — بہت ہی سجائی گئی تھی سڑک

دو طرفہ برابر تھے روشن کنول
دکھاتے تھے کیا کیا یہ جوبن کنول

ہوا سے اگر جھلملاتے تھے وہ
تو رنگیں ادائیں دکھاتے تھے وہ

وہ ہر جا تھے پرتو فگن راہ میں
شگفتہ تھا طرفہ چمن راہ میں

محل والیوں کا نکھرنا تھا قہر
وہ ہر دم کا اُن کا سنورنا تھا قہر

خواصوں کی طیاریاں کیا کہوں
وہ ان کی جفاکاریاں کیا کہوں

مسی ملتی تھی شوخ چنچل کوئی
لگاتی تھی آنکھوں میں کاجل کوئی

کھڑی تھی کوئی بال کھولے ہوئے
نگاہوں کی شمشیر تولے ہوئے

محل میں جو آیا وہ بسمل ہوا
وہاں کام کرنا بھی مشکل ہوا

چمکتی تھیں ہر سو ستارے کیطرح
نہ چین انکو دم بھر تھا پارے کیطرح

شرارت وہ ان شاطروں کی غضب
وہ چھب تختیاں کافروں کی غضب

مسی کی دھڑی سب جمائے ہوئے
دوالی کا کاجل لگائے ہوئے

سراپا ادا شوخ طناز سب
ستم کوش سرمایۂ ناز سب

کوئی ان میں نوخیز کوئی جوان
کوئی غارت جاں کوئی دلستان

تنیں اپنے جوبن سے بھی کچھ سوا
جفا کار چتوں سے بھی کچھ سوا

خرام انکا وہ اچپلاہٹ کیساتھ
وہ آنکھوں میں کاجل گھلاوٹ کے ساتھ

وہ کھانا تکلف سے ہر آن پان
نزاکت لطافت میں سب دھان پان

شگفتہ تھا چہرہ اُبلتا تھا رنگ
ٹپکتا تھا جوبن اچھلتا تھا رنگ

بہت زرق برق اور ٹھسے سے سب
سیہ مست الفت کے نشے سے سب

نہ دل ناز و عشوہ سے کس نے لیا
بچا اُس سے بڑھ کے تو اسنے لیا

ہر اک حور وش کی سجاوٹ جدا
وہ سج دھج جدا وہ بناوٹ جدا

قیامت بلا غارت ہوش سب
گل اندام گلفام گلپوش سب

کوئی بانکی ترچھی رسیلی کوئی
نکیلی سجیلی رنگیلی کوئی

کسی سے کوئی مسکراتی کہیں
کسی دل کو کوئی لبھاتی کہیں

کبھی چپ رہیں گنگنائیں کبھی
کبھی ہنس پڑیں مسکرائیں کبھی

چلیں دو قدم پھر سنورنے لگیں
دم اپنی سجاوٹ کا بھرنے لگیں

وہ غل شور آپس میں تکرار کا
پریشاں وہ ہونا محلدار کا

وہ لڑکوں کا غل میہمانوں کی دھوم
وہ گانے کا چرچا وہ تالوں کی دھوم

برات آنے سے منتظر سب کے سب
اسی فکر میں منتشر سب کے سب

سوار اتنے عرصہ میں دولھا ہوا
بڑا غل بڑا شور برپا ہوا

پڑی چوب ڈنکے گرجنے لگے
ہر اک قسم کے باجے بجنے لگے

چلا کوئی گھوڑے پہ ہو کر سوار
چلا کوئی ہاتھی پہ کر کے نکھار

کوئی شان سے پالکی پر چلا
کوئی بیٹھ کر نالکی پہ چلا

چلا شان کے ساتھ سارا جلوس
بڑھا لطف سے وہ سوارا جلوس

تکلف سے نوشہ کے ساتھی چلے
بڑی شان سے ان کے ہاتھی چلے

صدائیں وہ شہنا کی پیاری بہت
وہ آواز ڈنکے کی بھاری بہت

رواں آگے آگے وہ تخت رواں
وہ ان سب پہ نغمہ سرا رنڈیاں

وہ پلٹن کی صف وہ سواروں کا غول
جدا سب سے وہ عہدہ داروں کا غول

وہ فوجیں الگ وہ رسالے الگ
پیادے الگ باجے والے الگ

وہ ہر فوج کی ٹولی ٹولی الگ
وہ سج دھج الگ اور وہ بولی الگ

سماں آتش افروزیوں کا غضب
مزہ ان کی دلسوزیوں کا غضب

چمکتے تھے ہر سو ستاروں کے پھول
لئے لیتے تھے دل اناروں کے پھول

اڑا ماہ کا رنگ مہتاب سے
ہوا آسماں رنگ مہتاب سے

بلند اڑ کے اتنے غبارے ہوئے
کہ گردوں پہ جا جا کے تارے ہوئے

تماشائیوں کا وہ ہر سو ہجوم !
وہ آرائشوں کی سجاوٹ کی دھوم

ہر اک ملک کے تاجر ساتھ ساتھ
رئیسان عالی گہر ساتھ ساتھ

انھیں سب کے حلقے میں نوشاہ تھا
ستاروں میں جلوہ فگن ماہ تھا

بیاں کیا کروں اسکے سہرے کا نور
کیا اس نے دو چند چہرے کا نور

وہ سہرا کہ گل تر تھے جس پر نثار
وہ سہرا کہ گوہر تھے جس پہ نثار

وہ سہرا دکھاتا تھا جو شان حسن
وہ سہرا جو کہتا تھا ہوں جان حسن

وہ سہرا کہ جسمیں پڑی جان تھی
وہ سہرا دلہن جس پہ قربان تھی

وہ سہرا کہ آنکھوں کا جو نور تھا
وہ سہرا کہ جو گیسوِ حور تھا

وہ سہرا کہ حوران جنت کی جاں
وہ سہرا کہ تھا ساری زینت کی جان

وہ سہرا جو تھا باغ پیرائے حسن
وہ سہرا کہ تھا جلوہ آرائے حسن

چمکتا تھا چہرے پہ وہ اس طرح
شعاعیں رخ مہر پر جس طرح

مکان پر دلہن کے جو آئی برات
پہونچکر جو ہر سمت چھائی برات

تو ہلچل حویلی کے اندر پڑی
ہوئی اس کی اسوقت شہرت بڑی

یہ پردہ نشینوں کا احوال تھا
یہ ہر ایک سے شوق کا حال تھا

کہ تھیں بام پر سب چڑھیں شام سے
نہ مطلب تھا ان کو کسی کام سے

کوئی جا کے بیٹھی دریچے میں تھی
کبھی کوئی آکر جھروکے میں تھی

خواصوں نے چپکے دلہن سے کہا
یہ اس شاہد گلبدن سے کہا

کہ یہ سیر بھی قابل دید ہے
غنیمت ہے اور حاصل دید ہے

زن و مرد محو تماشا ہیں سب
تماشے میں ڈوبے سراپا ہیں سب

یہ غل ہے کہ دیکھو بنے کا نکھار
دکھاتا ہے کس طرح سہرا بہار

چلیں دیکھ لیں آپ بھی اک نظر
نہ ہم ہونے دیں گے کسی کو خبر

سنا یہ تو فوراً اٹھی وہ حسیں
اسے ساتھ کوٹھے پہ وہ لے گئیں

ہوئی اک طرف جا کے وہ جلوہ گر
لگی کرنے چھپ چھپ کے ہر سو نظر

لگی ڈھونڈھنے اپنے جانباز کو
قتیل ادا بسمل ناز کو

جو اک سمت اس نے اٹھائی نظر
تو حیراں وہ اس کو ہوئی دیکھ کر

بڑا واقعی نور چہرے پہ تھا
بڑا روپ پھولوں کے سہرے پہ تھا

وہ گلرو ہوئی شیفتہ اور بھی
ہوئی جان و دل سے فدا اور بھی

خواصیں بھی سب محوِ صورت ہوئیں
وہ سب نقش دیوارِ حیرت ہوئیں

وہیں سے بلائیں وہ لینے لگیں
دُعائیں اسے دل کے دینے لگیں

اتر آئی پھر واں سے شرما کے وہ
چھُپی چُپکے محلے میں پھر آ کے وہ

وہ نوشہ اِدھر زیبِ محفل ہوا
بڑی شان و شوکت سے داخل ہوا

ہوئی اس کی تعظیم و خاطر بڑی
مزہ اور بھی بڑھ گیا اس گھڑی

وہ مجلس بھی کیا لطف انگیز تھی
بڑی دلکشا تھی دل آویز تھی

سجے جھاڑ فانوس سے اس طرح
کہ آراستہ ہو دُلہن جس طرح

بہار اس کی ہاتھوں بڑھاتی تھی دل
ہر اک چیز اس کی لُبھاتی تھی دل

عجب نُور تھا شیشہ آلات پر
گماں روزِ روشن کا تھا رات پر

بلائے تھے دو طائفے نُور کے
کہ جن کو ملے تھے گلے نُور کے

اٹھیں جس گھڑی ناز و انداز سے
چلی راگنی پردۂ ساز سے

جدھر جھک پڑیں اک ستم ڈھا دیا
کلیجوں کو سینوں میں تڑپا دیا

کہیں رقص میں پاؤں جمتے نہ تھے
جگر نکلے آتے تھے تھمتے نہ تھے

کچھ ایسا اثر ان کے گانے میں تھا
وہ جادو ہر اک کے بتانے میں تھا

کہ حالت دلوں کی نہ تھی دل کی طرح
تڑپتے تھے سب مرغِ بسمل کی طرح

بندھا تھا مزے کا سماں رقص میں
نہ کرتی تھیں کیا رنڈیاں رقص میں

زمیں پر نہ آہستہ ٹھوکر پڑی ! !
جو ٹھوکر پڑی وہ جگر پر پڑی

ہر اک کو ادائیں دکھانا انھیں
دلوں کو لُبھانا رجھانا انھیں

کوئی شوخ سرمایۂ ناز تھی
کوئی حاکمِ ملکِ انداز تھی

کوئی ماہ پیکر تھی محفل فریب
کوئی نازنیں دلربا دلفریب

جواں و حسیں خوش گلو سب کی سب
حسیں نازنیں دلربا سب کی سب

سب اربابِ محفل ادھر وجد میں
سرِ چرخ زہرہ ادھر وجد میں

درون محل رنگ ہی اور تھا
وہ ساماں تھا عیش خود دنگ تھا

یہ صحن حویلی میں ساماں ہوا!
کہ دیکھا اسے جس نے حیراں ہوا

منگایا کوئی شامیانا وہیں
کھڑا کر کے لوگوں نے تانا وہیں

بچھایا پھر اک تخت اس فرش پر
دماغ اس کا پہونچا دیا عرش پر

اسے خوب آراستہ کر دیا !!
کھڑا اس پہ شربت کا بھی دھر دیا

کیا صدر آرا پھر اس تخت پر
بنے کو بلا کر بصد کر و فر

دلھن بھی اسی دم بلائی گئی !
بنے کے مقابل بٹھائی گئی

لگی ہونے ہر ایک رسم اب ادا
لگیں ہونے اب منتیں سب ادا

وہ اس دن کی بھی کیا تھی اچھی گھڑی
مزے کی تھی ساعت مزے کی گھڑی

عجب شبھ گھڑی تھی عجب وقت تھا
خوشی پھٹ پڑی تھی عجب وقت تھا

وہ پیاری دلہن کی بناوٹ ستم
وہ پوشش ستم وہ سجاوٹ ستم

وہ سب عطر میں اس کا ڈوبا لباس
وہ سہرے کا عالم وہ سوہا لباس

وہ دلکش لپٹ پھول کے ہار کی
تجلی وہ گھونگھٹ میں رخسار کی

وہ ہاتھوں کی مہندی کی خوشبو ستم
لپٹ اس لطافت کی ہر سو ستم

دلہن کی وہ دولھا کو قربت غضب
گلے سے لگانے کی حسرت غضب

وہ ہر سو مبارک سلامت کی دھوم
دلھن کی وہ زینت وہ صورت کی دھوم

نچھاور کی خاطر جھگڑتی کوئی
کہیں نیگ لینے میں لڑتی کوئی

وہ گٹھ بندھن ان کا مزہ دیکھیا
یہ وقت اور لوگوں کا دل لے گیا

دُعا کے لیے لوگ بڑھنے لگے
برہمن کچھ اشلوک پڑھنے لگے

پھرے اٹھ کے باہم جو وہ سات بار
تو باقی نہ دل پہ رہا اختیار

یہ عالم ہوا لوگ غش کھا گئے
برہمن پہ وہ بہت بھی چکرا گئے

دلہن نے نزاکت سے اکبار پھر
گلے کا وہ اپنے حسیں ہار پھر

دیا ڈال گردن میں نوشاہ کے
مزے اپنے دکھلا دیئے چاہ کے

جھکی پھر کرشمہ کے انداز سے ۔۔۔ کٹورے میں شربت لیا ناز سے
لیا پہلے ہونٹوں سے اپنے لگا ۔۔۔ دیا اس کو پھر اسکے منھ سے لگا
جو شربت دیا منھ لگا کر اسے ۔۔۔ نہ بھولا مزہ زندگی بھر اسے
غرض اس سے جب انکو فرصت ملی ۔۔۔ وہ رسمیں ہوئیں ختم مہلت ملی
تو نوشاہ اندر سے رخصت ہوا ۔۔۔ وہ پھر آکے محفل کی زینت ہوا
دلہن رخصت اتنے میں ہونے لگی ۔۔۔ گلے سب سے مل مل کے رونے لگی
ہوئی اسکی ماں غم سے مضطر بہت ۔۔۔ وہ روئی گلے سے لگا کر بہت
خواصیں بھی سب اس کی رونے لگیں ۔۔۔ سب اس وقت جاں اپنی کھونے لگیں
طلب نوشہ پھر گھر کے اندر ہوا ! ۔۔۔ وہاں لطف پہلے سے بڑھ کر ہوا
دلہن کی سواری منگائی گئی ! ۔۔۔ وہ ڈیوڑھی پہ لاکر لگائی گئی !
مزے کی ہوئی رسم پھر کچھ ادا ۔۔۔ بڑا لطف وہ وقت پھر دے گیا !
دلہن پھر ہوئی پالکی میں سوار ۔۔۔ چلا لے کے دولھا بصد افتخار
چلا لعل و گوہر لٹاتا ہوا ! ۔۔۔ دل اپنا ہر اک کو دکھاتا ہوا !
جہیز اس کو حد سے زیادہ ملا ۔۔۔ کروں کیا صراحت کہ کیا کیا ملا
مکاں میں وہ آیا بڑی دھوم سے ۔۔۔ دلہن بیاہ لایا بڑی دھوم سے
ہوئی فکر آتے ہی اس بات کی ۔۔۔ کہ دن جانے آئے گھڑی رات کی
کسی طرح بارے وہ دن کٹ گیا ۔۔۔ اسے مضطرب دیکھ کر ہٹ گیا
چمکنے لگا چرخ پر ماہتاب ۔۔۔ ہوا ہر طرف جلوہ گر ماہتاب
اب ان کے ملانے کا چرچا ہوا ۔۔۔ مرتب وہ کوٹھے کا کمرا ہوا
نیا فرش اس میں بچھایا گیا ۔۔۔ وہ عشرت کدہ اک بنایا گیا
تکلف سے مسند بھی سج دی وہیں ۔۔۔ دھرا لاکے اک عطر داں بھی وہیں
وہیں خاصداں پاندان رکھ دیا ! ۔۔۔ سجا ایک گلداں وہاں رکھ دیا
وہ نادر مسہری بچھائی گئی ! ۔۔۔ وہ توشک پہ چادر لگائی گئی

کہ لوٹ اس پہ سب کی طبیعت ہوئی / اسی بات کی دل کو حسرت ہوئی

کہ اس پر سرِ شام سے سوئیے / لپٹ کر دل آرام سے سوئیے

ادھر کچھ دھرے اس پہ بیلے کے پھول / چنے سوتیے کے ادھر نانے پھول

بننے کو بٹھایا بلا کر وہیں / دیا چھوڑ مضطر کو لا کر وہیں

خواصیں دلھن کو بھی لیکر چلیں / اسے لیکے اب سب وہ اوپر چلیں

چلیں اس کو لے کر بڑی شان سے / بڑے کر و فر اور ساماں سے

چلی وہ سمن بر لجھاتی چلی / قدم ناز کے ساتھ اٹھاتی چلی

چلی منھ پہ سہرے کو ڈالے ہوئے / وہ تھوڑا سا گھونگٹ نکالے ہوئے

ادا ناز کو ساتھ لے کر چلی / چلی لیکے غمزوں کا لشکر چلی

طلائی کڑے پاؤں پڑتے چلے / چھڑوں سے جفا کار لڑتے چلے

لبوں پر تبسم وہ ہر بات میں / بھرا رس وہ ابھری ہوئی گات میں

وہ زلفیں وہ جوڑے کی بندش غضب / وہ قد اس کا آفت وہ پوشش غضب

لچکنا کلائی کا کنگن سے وہ / نیا روپ بازو پہ جوشن سے وہ

وہ جھمکوں کا کچھ جھومنا بار بار / وہ بے پوچھے منھ چومنا بار بار

وہ دستِ حنائی کی رنگت ستم / وہ چھلوں کی پوروں میں کثرت ستم

بدن جابجا سے چھپائے ہوئے / نمودار چیزیں چرائے ہوئے

وہ گلفام آئی جو اس ٹھاٹھ سے / وہ تشریف لائی جو اس ٹھاٹھ سے

تو وہ منتظر قتل ہی ہو گیا / دل مضطرب ہاتھ سے کھو گیا

بغل میں وہ اس کے بٹھائی گئی / وہ پہلو کی زینت بنائی گئی

بٹھا کر اسے واں سے سب ہٹ گئیں / بہلنے سے وہ کام کو ہٹ گئیں

وہ کچھ دیر خاموش پہلے رہے / رکے اور چپ دونوں بیٹھے رہے

ادہر رعب حسن اور حیا اس طرف / ادھر آنکھ اٹھی۔ سر جھکا اس طرف

ادہر صبر منھ اس سے پھیرے ہوئے / ادھر شرم اس بت کو گھیرے ہوئے

ادھر کچھ کچھ اس کا کھسکنا غضب
ادھر وہ سمٹنا جھجکنا غضب

تقاضا ادھر دل کا گھونگٹ الٹ
نہ کر اس میں اب دیر جھٹ پٹ الٹ

ادھر اس پہ تاکید ہٹنا نہ تو
خبردار گھونگھٹ الٹنا نہ تو

نہ اٹھنا اسی طرح ہاں اے نظر
نہیں اچھی یہ شوخیاں اے نظر

نہ ہونٹوں سے باتو نکلنا ذرا
حیا تو یہاں سے نہ ٹلنا ذرا

ہنسی اس گھڑی تو نہ آنا کہیں
مرے ہونٹو تم کھل نہ جانا کہیں

ادھر کہہ رہی تھی وہ گلفام یہ
ادھر بڑھ کے اس نے کیا کام یہ

کہ چہرے سے گھونگھٹ الٹ ہی دیا
اسے بڑھ کے اسنے پلٹ ہی دیا

لگا کرنے خالق کی قدرت نظر
لگا ہونے قرباں اس حور پر

اڑا ہوش اب اس پر بہزاد کا
کہ موقع تھا غل کا نہ فریاد کا

لگی کہنے تم کو ہوا ہے یہ کیا
تمہیں خیر تو ہے یہ کیا ہے یہ کیا

سنو تو یہ مجھکو بلاتی ہے کون
یہ چوڑی بجی کسکی آتی ہے کون

ارے در سے بھی تو لگی ہے کوئی
ہٹو جلد وہ دیکھتی ہے کوئی

غرض شب وہ یوں ہی بسر ہو گئی
وہ سونے نہ پائے سحر ہو گئی

ہوئی صبح آئی گجر کی صدا
چلی اڑ کے مرغ سحر کی صدا

ابھی تک جو تھے جگمگاتے ہوئے
وہ تارے چلے جھلملاتے ہوئے

جو سوتی تھی جانباز صادق کے ساتھ
بسر کی تھی شب اپنے عاشق کیساتھ

ابھی تک ہے وہ بے خبر سو رہی
اسی طرح ہے اینڈ کر سو رہی !

بڑا حسن بکھرے سنگاروں پہ ہے
بڑا لطف ان باسی ہاروں پہ ہے

رتن سین سویا تھا بس ویسے ہی
مگر آنکھ اس کی کھلی جلد ہی

کہا اب ٹھہرنا مناسب نہیں
چلا آیا باہر وہ اٹھ کر وہیں

وہ نکلا تو پہونچیں خواصیں وہاں
ہوئیں جمع سب اسکی ہمجولیاں

یہ دیکھا کہ وہ خواب راحت میں ہے
بڑا فرق چہرے کی رنگت میں ہے

سنگار اس حسیں کا ہے لوٹا ہوا — پڑا ہے الگ ہار ٹوٹا ہوا
وہ رنگ اسکے پتلے لبوں کا نہیں — وہ مسی نہیں ہے وہ لاکھا نہیں
پریشاں ہیں افشاں کے تارے پڑے — ہیں بستر پہ روشن ستارے پڑے
پریشاں کھل کر گندھے بال ہیں — وہ کافر بچھائے ہوئے جال ہیں
کوئی لٹ تو گردن کے ہے اردگرد — کوئی روئے روشن کے ہے اردگرد
کھلی زُلف جو پا گئی ہے کمر — تو ساتھ اسکے بل کھا گئی ہے کمر
دوپٹا سینے سے کھسکا ہوا — مسہری سے باہر ہے لٹکا ہوا
ہنسیں سب تو وہ گلبدن جاگ اٹھی — وہ گلپوش غنچہ دہن جاگ اٹھی
لگیں چھیڑنے اٹھتے ہی سب کی سب — لگیں کرنے وہ دل لگی اس سے اب
کہ چولی ہے مسکی ہوئی کس لئے — یہ پوشاک ہے ملگجی کس لئے
پڑے ہیں یہ گالوں پہ کیسے نشاں — یہ کاہکے ہیں نیلے نیلے نشان
یہ ماتھے کی افشاں گئی چھوٹ کیوں — گئیں چوڑیاں ہاتھ کی ٹوٹ کیوں
لب سُرخ کی ہوگئی کیا مسی — زرا روبرو لائیے آرسی
بتائیے تو سرکار ہے بات کیا — یہ کیوں مٹ گیا منہ ہوا رات کیا
یونہیں دیر تک وہ ستاتی رہیں — اسی طرح ہنستی ہنساتی رہیں
اسے لے گئیں پھر وہ حمام میں — لگیں جا کے اس حور کے کام میں
نہا دھو کے نکلی وہ بت اسطرح — نکل آئے چاند ابر سے جسطرح
نئے سر سے پھر محو زینت ہوئی — بنی پھر پری، پھر قیامت ہوئی
ہر اک کپڑے اس گل نے پہنے نئے — سجے اس نے پھر سارے گہنے نئے
کیا جی لگا کر نکھار اس طرح — کھلا اس پہ اس دن سنگار اسطرح
کہ لینے لگا خود بلائیں سنگار — لگا تکنے منہ آئینہ بار بار
وہ دن جوش کے عنفواں شباب — وہ دونوں تھیں اسکی جان شباب
نگاہیں تھیں آشوب دہر اور بھی — کمر پتلی پتلی تھی قہر اور بھی

بیاں کیا کروں رنگ کا روپ کا — گماں تن کے سایے پہ تھا دھوپ کا
ہوئی شب تو پھر گرم خلوت ہوئی — بہم پھر اسی طرح صحبت ہوئی
رہیں باتیں اس شب بہم دیر تک — رہا ہجر کا ذکرِ غم دیر تک
بتایا رتن سین نے حال سب — کہا اپنی فرقت کا احوال سب
کہ فرقت میں تڑپا میں اس اس طرح — ہوا خوار رسوا میں اس اس طرح
کہا اس نے میری جو حالت رہی — مری جان پر جو مصیبت رہی
ہوا ہوگا ویسا نہ صدمہ تمہیں! — نہ پیش آئی ہوگی وہ ایذا تمہیں
تم آزاد تھے ڈر کسی کا نہ تھا — خطر خوف تِل بھر کسی کا نہ تھا
ہوا غم تو جی کھول کر رو لیا — جگر سے غبارِ الم دھو لیا
اسی طرح دل کو سنبھالا کیے — پھر اس اپنے دل کی نکالا کیے
یہاں سخت آفت تھی میرے لیے — غضب کی قیامت تھی میرے لیے
مجھے باپ ماں کا تھا ڈر ہر گھڑی — محل والیوں کا خطر ہر گھڑی
کبھی ڈر سے نالا نہ میں کر سکی — کبھی سرد آہیں نہ میں بھر سکی
رہی ہوش کے ساتھ بے ہوش میں — دل زار نالاں تھا خاموش میں
کہا خواب کا سب وہ احوال پھر — بتایا وہ تعبیر کا حال پھر
اسی لطف سے اب گزرنے لگی — یونہی دن یونہی شب گزرنے لگی
اسی سے رتن سین کو کام اب — اسی حور سے دل کو آرام اب
نہ فکر اب اُسے سلطنت کی رہی — نہ یاد اس کو کچھ ناگمت کی رہی

رتن سین کی جدائی میں ناگمت کا تڑپنا پپیہے کا خط لیجانا!

گیا مجکو ساقی کدھر چھوڑ کر — کہاں جا کے بیٹھا ہے منہ موڑ کر
طبیعت تری مجھ سے کیوں پھر گئی — وہ چاہت نگاہوں سے کیوں گر گئی
خفا ہو گیا مجھ سے تو کس لئے — گیا روٹھ اے ابر تو کس لئے

دغا مجکو یوں ہائے دینا نہ تھا — مری جان ترسا کے لینا نہ تھا

ستم ہائے مجھ عاشق زار پر — جفائیں یہ اپنے دل افگار پر

رتن سین جوگی ہوا جس گھڑی — ہوا ناگمت سے جدا جس گھڑی

تو اس غم کی ماری کا جی رک گیا — جگر آتش عشق سے پھنک گیا

لگی چوٹ وہ دل پہ تیورا گئی — ہوا درد ایسا کہ غش کھا گئی

وہ گلپوش بیہوش پہروں رہی — وہ غش سے ہم آغوش پہروں رہی

کسی طرح ہوش اسکو آتا نہ تھا — کلیجے کا درد اسکے جاتا نہ تھا

جو گھنٹوں میں کچھ ہوش آیا اُسے — تو خوں اس الم نے رُلایا اُسے

اُسے قید خانہ حویلی ہوئی ! — کہا ہائے اب میں اکیلی ہوئی

رتن سین کی بے وفائی کا غم — جدائی کا غم کج ادائی کا غم

کلیجے کو ہر وقت کھانے لگا — جگر میں سما کر لٹانے لگا

خفا ہے سبب دل سے راحت ہوئی — بدن میں جو طاقت تھی رخصت ہوئی

دیا چھوڑ اُمید نے آس نے — کیا دل میں گھر درد نے یاس نے

ہوئی درد فرقت سے دلگیر وہ — سراپا ہوئی غم کی تصویر وہ

زمانہ اندھیر نظر میں ہوا — غم و درد کا گھر جگر میں ہوا

بڑھا درد دل جوش سودا ہوا — غم ہجر قطرے سے دریا ہوا

ہوا جوش غم چشم نم ہو چلی — وہ شوخی نگاہوں سے کم ہو چلی

سوا دن سے راتوں کو رونے لگی — سحر آنکھوں میں ہونے لگی

گراں پیرہن اسکو تن پر ہوا — وہ جینا جدائی کا دوبھر ہوا

لگی کھنچنے آہ وہ ناتواں — نکلنے لگا اسکے منہ سے دھواں

جو ننھے پھول سے گال کو لے ہوئے — وہ جوبن جگر کے پھپھولے ہوئے

وہ سلجھے ہوئے بال نوچے کبھی — وہ چکنے بھرے گال نوچے کبھی

کبھی سر کو پکڑے جھکائے کبھی — کبھی دل کو تھامے دبائے کبھی

جھڑی آنسوؤں کی ڈبونے لگی — خفا آپ ہی پردہ ہونے لگی

لگی کہنے کی دشمنی سب نے ہائے — مرے ساتھ کی رہزنی سب نے ہائے

کرشموں نے کبھی کچھ نہ ٹوکا اسے — نہ غمزوں نے کبھی ہائے روکا انھیں

کیا کچھ نگاہوں نے جادو نہ ہائے — چلے پیچ کچھ اس پہ گیسو نہ ہائے

یہ پازیب تو پاؤں پڑتی ذرا — کمر کردھنی تو پکڑتی ذرا

یہ منھ دیکھتی آرسی کیوں رہی — یہ منھ باندھے چنپا کلی کیوں رہی

نہ چوڑی نے کبھی ہاتھ پکڑا ذرا — نہ زنجیر نے پاؤں جکڑا ذرا

چل اب یاں سے جگنی مرک دور ہو — نہ سینے پہ میرے چمک دور ہو

گلا چھوڑ دے پچلڑی تو بھی اب — نہ رہ ناک میں نتھ پڑی تو بھی اب

لٹک تیری لٹکن خوش آتی نہیں — یہ چمک تیری بجلی یہ بھاتی نہیں

مرے پاؤں سے تو بھی چھاگل نکل — گلے سے مرے تو بھی ہیکل نکل

کلائی مری چھوڑ کنگن ذرا — سرک میرے بازو سے جوشن ذرا

مرے سر کا بار اب یہ جھومر ہے کیوں — بھلا چاند اب یہ مرے سر ہے کیوں

گراں تیری چھن چھن یہ گھنگرو ہے اب — مری جوتیوں پر اسے تو ہے اب

مرے دل کا داغ اب یہ جگنو بھی ہے — مرے ٹھینگے پر آرسی تو بھی ہے

دکھاتے ہیں پتے مرے کان کیوں — یہ ہل ہل کے لیتے ہیں اب جان کیوں

اسی طرح ہر وقت بکنے سے کام — زمیں پر اسے سر ٹپکنے سے کام

نہ پوشاک کی قدر و عزت رہی — نہ زیور سے اس کو محبت رہی

دیا پھینک سٹکی کو مل کر کبھی — دیا پھونک لچکے کو جل کر کبھی

کبھی پھاڑتی تھی گریباں کی بیل — کبھی نوچ لیتی تھی داماں کی بیل

الگ چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں — ادھر پھینک دیں کچھ ادھر پھینک دیں

کبھی پھینک دی کیل کچھ سوچ کر — کبھی پھینک دیں بالیاں نوچ کر

نہ نازک کلائی میں کنگن لہے — نہ بازو پہ سونے کے جوشن لہے

نہ پاؤں میں چھاگل کڑے رہ گئے
نہ وہ پتلے پتلے چھڑے رہ گئے
نہ ہاتھوں میں مہندی کی رنگت رہی
نہ پوروں میں چھلوں کی کثرت رہی
نہ غم تھا جو چولی ہوا سے کھلی
جو چوٹی کھلی تو بلا سے کھلی
مہینوں وہ کپڑے بدلتی نہ تھی!
کبھی عطر پھولے سے ملتی نہ تھی
نہ کھانے کا اس کو نہ پینے کا ہوش
نہ مرنے کی پروا نہ جینے کا ہوش
جہاں کچھ کہا اشک بہنے لگے
کلیجے پہ ہاتھ اس کے رہنے لگے
مسرت گئی دل سے راحت گئی
نہ پلٹی بدن سے جو طاقت گئی
لبوں سے جدا آہ ہوتی نہ تھی
کبھی درد دل سے وہ سوتی نہ تھی
اسے نیند اک آن پڑتی نہ تھی
وہ گلفام پہچان پڑتی نہ تھی
گھٹا دن دن اسکی جوانی کا زور
بڑھا دن دن اب ناتوانی کا زور
روی دن دن اب اس کی حالت ہوئی
تپ ہجر سے زرد صورت ہوئی
شب و روز تھا دل کو رونا پسند
نہ کھانا نہ پینا نہ سونا پسند
نہ وہ چاندسی اس کی صورت رہی
نہ اگلی سی چہرے کی رنگت رہی
ستمگر جگر میں وہ غم رہ گیا
لب خشک پر آکے دم رہ گیا
بھرے دل میں رنج و الم سیکڑوں
جگر ایک تھا اور غم سیکڑوں
کلیجے کو غم چھوڑتا ہی نہ تھا
قلق دل سے منہ موڑتا ہی نہ تھا
تڑپتی یہ دل کی جلن ہر گھڑی
لب لعل پر یہ سخن ہر گھڑی
کہ ظالم ترے دل میں آئی یہ کیسا
مرے ساتھ کی بے وفائی یہ کیا
ترے غم نے تو مار ڈالا مجھے
ڈبوتا ہے اشکوں کا جھالا مجھے
جہاں مجھ کو سنسان ہے بے ترے
مرا قصر ویران ہے بے ترے
خدا کے لیے اب تو صورت دکھا
نہ راہ اپنی اے بے مروت دکھا
جدائی کے صدمے سہوں کب تلک
مسہری پہ تنہا رہوں کب تلک
اسی طرح کہہ کہہ کے رونا اسے
تڑپنا اسے جان کھونا اسے

کسی دم جو وحشت سوا بڑھ گئی
تو گھبرا کے کوٹھے پہ وہ چڑھ گئی

لگی کرنے ہر سو وہ گلرو نظر
لگی ڈھونڈھنے اسکو ہر سو نظر

نہ دل کی وہاں بھی جو وحشت گئی
جو وہ چشم تر کی نہ رقت رہی

تو وہ پھر اتر آئی روتی ہوئی
تڑپتی ہوئی جان کھوتی ہوئی

بنی ساس کے جان پر غم سے تھی
پریشاں وہ خستہ جگر غم سے تھی

وہ بیٹے کا اسکو الم اک طرف
بہو کی جوانی کا غم اک طرف

دوا اسکے دُکھ کی وہ پاتی نہ تھی
سمجھ میں کوئی بات آتی نہ تھی

خواصیں بھی تھیں اسکی حیران بہت
اسے دیکھ کر تھیں پریشاں بہت

وہ بہلاتی تھیں گرچہ جی ہر گھڑی
کیا کرتی تھیں دلدہی ہر گھڑی

مگر دل کچھ اس کا بہلتا نہ تھا
وہ کانٹا جگر سے نکلتا نہ تھا

غمِ دل سے اک روز گھبرا کے وہ
لگی پھرنے گلزار میں جا کے وہ

کہ کچھ دیر بہلے چمن ہی میں دل
لگے لسترن یا سمن ہی میں دل

مگر واں بڑھا درد و غم اور بھی
لگی ڈھانے فرقت ستم اور بھی

جلایا اُسے گرم نالے نے اور
دیئے داغ پر داغ لالے نے اور

قلق یوں ہوا اس کے جی پر بنی
نسیم چمن دل کا نشتر بنی

ستانے لگا شور بلبل اُسے
رلانے لگا خندۂ گل اُسے

بڑا سنبل و گل سے صدما دیا
نظر آئے اور اسکو تڑپا دیا

اُسے پھول سے گال یاد آ گئے
وہ سلجھے ہوئے بال یاد آ گئے

جو دیکھا سماں سرو گلزار کا
تو یاد آ گیا اسکو قد یار کا

اُسے آنکھ ابل کر ڈبونے لگی
یہ کہہ کہہ کے وہ حور رونے لگی

کہ پاؤں میں تیری خبر کس طرح
مٹے ہائے درد جگر کس طرح

نہیں کوئی اتنا کہ لیجائے خط
مرا تجھ تلک جا کے پہونچائے خط

وہ نیچے تھی جس پیڑ کے نوحہ گر
پپیہا تھا بیٹھا اک اس پیڑ پر

ہوا دیکھ کر اسکو صدمہ بڑا — وہ پاس اسکے اس پیڑ سے گر پڑا
پھڑکنے لگا اسکے پاس اس طرح — گلے پر چلی ہو چھری جس طرح
لیا گود میں اسنے اپنے اٹھا — کہا ہائے یہ حال پہونچا مرا
کہ چڑیوں سے بھی دیکھا جاتا نہیں — دیئے دیتے ہیں اپنی جان حزیں
وہ چپ اس طرح ہاتھ میں اسکے تھا — کہ گویا وہ اس سے تھا یہ کہہ رہا
کہ دل تیرے غم کا مٹا دوں گا میں — خبر تیرے پیارے کی لا دوں گا میں
وہ سوچی عجب کیا یہ لیجائے خط — یہ جا کر مرا اوسکو پہونچائے خط

منگایا پھر اس نے قلمداں وہیں
لکھا اپنا حال پریشاں وہیں

ناگمت کا خط

لکھا بے وفائے زمانہ اُسے — لکھا عاشق نمائشانہ اُسے
شہ کشور بے وفائی لکھا — در بحر نا آشنائی لکھا
لکھا اس کو اے راحت دل مرے — جفا کار جلاد قاتل مرے
ستمگر دل آزار نا آشنا ! — محبت کے دشمن جفا آشنا
کہاں چھا رہا بیوفا جا کے تو — کدھر رم رہا مجکو ترپا کے تو
تجھے فکر کچھ ناگمت کی بھی ہے — خبر اس کی کچھ خیریت کی بھی ہے
تری ناگمت تو جہاں سے چلی — ترے گھر سے تیرے مکاں سے چلی
چلی روٹھ کر زندگانی سے وہ — چلی پھیر کر منھ جوانی سے وہ
اُسے ہائے تو نے دغا دی بڑی — خطا کچھ نہ تھی اور سزا دی بڑی
یہ کیا ظلم تو نے ستمگر کیا — ارے قہر کیا تو نے مجھ پر کیا
کہاں وہ ترا عہد یاری گیا — کدھر دعوۂ آشنائی گیا
کدھر وہ تری جھوٹی الفت گئی — کدھر وہ زبانی محبت گئی

یہی مجھ سے اُلفت کا اقرار تھا
یہی مجھ سے چاہت کا اظہار تھا

وہ اقرار و قول و قسم کیا ہوئے
ہوئے تھے جو وعدے بہم کیا ہوئے

سمجھے بیوفائی مناسب نہ تھی
یہ بے اعتنائی مناسب نہ تھی

یہ بے مہریاں مجھ سے عاشق کے ساتھ
جفائیں یہ جانباز صادق کے ساتھ

جہاں میں یہ کیوں ہائے بھیجا مجھے
کھلا کچھ بھی مطلب نہ اسکا مجھے

مجھے تو نہ دُنیا کی لذت مِلی
کسی روز دل کو نہ راحت مِلی

مجھے آنکھیں دیکر دکھایا نہ کچھ
دئے دانت لیکن کھلایا نہ کچھ

گھڑی بھر کی بھی مجھکو راحت نہ دی
دیا دل تو اوسکو مسرت نہ دی

اکیلی بھری انجمن میں رہی
پریشاں ہمیشہ چمن میں رہی

بہاریں بہت گرچہ آئیں گئیں
گھٹائیں بہت آئیں چھائیں گئیں

بہت غنچہ و گل کھلے باغ میں
بہم بلبل و گل ملے باغ میں

تماشے ہزاروں جہاں میں ہوئے
مزے جشن ہر ہر مکاں میں ہوئے

نہ راحت مجھے پر ملی ایک دن
کلی پہ نہ دل کی کھلی ایک دن

لکھا تو مقدر میں تھا اس طرح
خوشی مجکو ہوتی بھلا کس طرح

زمانے میں غم کس کو ہوتا نہیں
بھلا کون دُکھ پاکے روتا نہیں

مگر ہوگا مضطر نہ کچھ سا کوئی
ملے ڈالتا ہے کلیجا کوئی

نہ پیچھے ترے ہائے کیا کیا ہوا
نہ کیا کیا کلیجے پہ صدما ہوا

کیا کیا نہ آ آکے برسات نے
نہ کیا کیا کیا چاندنی رات نے

بچھڑا مجھ سے تُو کیا جہاں پھر گیا
زمیں پھر گئی آسماں پھر گیا

تجھے مجھ سے کچھ ہائے الفت نہ تھی
تری جیسی صورت تھی سیرت نہ تھی

ارے بیوفا تو نے یہ کیا کیا !
بہت تو نے یہ کام بے جا کیا

بتا تو ہی یہ غم سہوں کس طرح
مکاں میں اکیلی رہوں کس طرح

بنا تیرے کیوں کر جوانی کروں
بسر کس طرح زندگانی کروں

نہیں سوجتا کچھ کدھر جاؤں میں
یہ جی میں ہے کچھ کھا کے مر جاؤں میں

ستمگار تہوار آتا ہے روز
مجھے آ کے ظالم ستاتا ہے روز

نکھرتی ہیں ہر بار ہمجولیاں
مناتی ہیں تہوار ہمجولیاں

وہ صدموں کی ماری خوشی کیا کرے
وہ مغموم خوش اپنا جی کیا کرے

کہ جب گھر میں گھر کا اُجالا نہ ہو
لگا کر گلے سونے والا نہ ہو

کٹے ہائے برسات تو کس طرح
کٹے چاندنی رات تو کس طرح

کٹیں کس طرح زندگانی کے دن
جوانی کی راتیں جوانی کے دن

لگا پھل نہ نخل تمنا میں ہائے
رہی تشنہ لب بیچ دریا میں ہائے

گئی رُت بدل پر نہ آئی بہار
سراندیپ میں جا کے چھائی بہار

ہر اک سمت بادل برستا رہا
مگر کھیت میرا ترستا رہا

یہ شادی مجھے راس آئی نہ ہائے
مسرت نے صورت دکھائی نہ ہائے

لپٹ کر بہم کاش سوتی نہ میں
گنہگار دو دن کی ہوتی نہ میں

وہ بہتر تھا رہتی جو انجان ہی
نہ ہوتی یہ کچھ جان پہچان ہی

یہ گڑیوں کا سا بیاہ کس نے کیا
یہ رسوا مجھے ہائے کس نے کیا

گھڑی بھر کو تو میں سہاگن ہوئی
مگر خوش نہ کچھ میں ابھاگن ہوئی

دلہن بن کے کنواری کی کنواری رہی
نہ دو روز بھی ہمکناری رہی

نہ لذت ملی پیار کی چاہ کی
مجھے مفت تہمت لگی بیاہ کی

کھلی تھی نہ گل کی کلی جب تلک
وہ بلبل کی پیاری رہی تب تلک

کھلی وہ تو بلبل جدا ہو گیا
خفا اس سے وہ بے خطا ہو گیا

بلا تو تری جب ستاتا نہ تھی
لڑکپن تھا کچھ تیری پروا نہ تھی

جواں جب ہوئی مجھ سے تو چھٹ گیا
مرے شوق کا قافلہ لٹ گیا

دغا گر مرے ساتھ کرتے نہ تم
جو [illegible] سوکن پہ مرتے نہ تم

تو کاہے کو ہوتی یہ حالت مری
پہ چڑھتی یہ کاہے کو نوبت مری

ہوا خیر جو کچھ مشیت میں تھا
یہی میری تقدیر و قسمت میں تھا

یہاں تک تجھے اب ہے آنا ضرور
مجھے شکل ہے اب دکھانا ضرور

لبوں پر ہے دم شوق دیدار میں
پڑی ہے مری ناؤ منجدھار میں

نہ چھوڑ اب مرا ساتھ بہر خدا
پکڑ لے مرا ہاتھ بہر خدا

یہ خط لکھ چکی جب وہ اندوہگیں
دیا پر میں باندھ اسکے اس نے وہیں

وہ خط واں سے لیکر پپیہا اڑا
ہوا پہ اسی رخ وہ سیدھا اڑا

کئی روز جب وہ سفر کر چکا
جو طے راہ میں بحر و بر کر چکا

تو پہونچا دیا جا کے وہ نامہ بر
پڑا قصر شاہی کی چھت پر اتر

وہاں سے جو اس نے لیا کچھ پتا
تو کوٹھے ہی پر وہ تھا رونق فزا

فقط تھا وہی اور وہ مہ جبیں
وہی اس کے پہلو میں تھی ہمنشیں

یہ موقع غنیمت جو آیا نظر
تو آ بیٹھا اڑ کر وہیں ہاتھ پر

وہ حیرت میں آیا اسے دیکھ کر
بندھا پر میں وہ خط بھی آیا نظر

اسے کھول کر خط جو اس نے پڑھا
تو لکھا ہوا ناگمتا کا وہ تھا

نکل آئے آنسو اسے دیکھ کر
بہت ہی ہوا اس کے دل پر اثر

تردد بہت پدمنی کا بڑھا
معاً لیکے اس خط کو اس نے پڑھا

گئی وہ سمجھ ناگمتا کا ہے خط
اسی نے یہ اس طرح بھیجا ہے خط

ہوئی وہ بھی بیخود نکل آئے اشک
اور آنکھوں سے گالوں پہ ڈھل آئے اشک

لگی کہنے چلنا ضروری ہے اب
گزر جائے گی ورنہ وہ غنچہ لب

جواب اس کا تم ان کو لکھ دو ابھی
کہ ملتا ہوں میں آ کے اب جلد ہی

اسے ضبط کی اب نہ خودی تھی تاب
لکھا اس نے اس طرح اس کا جواب

رتن سین کا خط

مری شیفتہ راز دار قدیم　　مری مہرباں غمگسار قدیم

نزاکت کی تصویر جوہی کی پھول　　چنبلی کی کونپل چنبلی کی پھول

مری مبتلا اور عاشق مری　　ہمیشہ کی غمخوار صادق مری

جُدائی کی میری ستائی ہوئی　　غم ہجر کی بلبلائی ہوئی

مری جاں تمہارا جگر دوز خط　　غم اندوز جانکاہ دلسوز خط

نہایت نفیس اور اچھا لکھا　　انھیں نرم نرم انگلیوں کا لکھا

مجھے واں سے قاصد نے لا کر دیا　　غم و درد کا مجکو دفتر دیا

کیا اسکے فقروں نے خنجر کا کام　　کیا غم کے لفظوں نے نشتر کا کام

کیا مجکو غمناک ہر لفظ نے　　جگر کو کیا چاک ہر لفظ نے

جو کچھ تم نے لکھا ہے بیجا نہیں　　تمہارا جو شکوہ ہے بیجا نہیں

کرے گا نہ یوں کج ادائی کوئی　　نہ یوں دے گا داغ جدائی کوئی

اسی سے تو سردر گریباں ہوں میں　　خجل ہوں پشیماں ہوں نالاں ہوں میں

لجاتا ہوں میں منہ دکھاتے ہوئے　　بہت شرم آتی ہے آتے ہوئے

مرا جُرم بخشو خدا کے لیئے　　معاف اب کرو کبریا کے لیئے

تمہاری قسم جب سے آیا ہے خط　　پپیہے سے جسدم سے پایا ہے خط

تڑپتا ہوں میرا بُرا حال ہے　　بہت ہی ردّی دل کا احوال ہے

قرار اک گھڑی دل کو آتا نہیں　　تمہارا قلق دل سے جاتا نہیں

تمہیں دیکھوں اب آرزو ہے یہی　　ان آنکھوں کو اب جستجو ہے یہی

مرے اب پہنچنے میں وقفہ نہیں　　روانہ ہوا یاں سے عرصہ نہیں

مری جان لکھتی ہو سوکن جسے　　سمجھتی ہو تم اپنا دشمن جسے

تمہاری بہت ہی وہ مشتاق ہے　　جُدائی تمہاری اسے شاق ہے

محبت کا دم یاں سے بھرتی ہے وہ — تمہیں بندگی عرض کرتی ہے وہ

جواب اس کے نامے کا لکھ کر ہی — دیا پر میں باندھ اسنے بھی ویسا ہی
رکا پھر نہ واں سے پپیہا چلا — جواب اس کا پاتے ہی سیدھا چلا
سفر کی وہ سب سختیاں جھیل کر — کڑی جھیل کر جان پر کھیل کر
وہ نامہ اسے اس نے لاکر دیا — تپ غم کا تعویذ لاکر دیا
ہوئی دیکھ کر خط تسلّی اُسے — ہر اک لفظ نے دی تشفی اُسے
مگر دل کو سوکن کا بھایا نہ ذکر — پسند اپنے ساتھ اسکا آیا نہ ذکر

رتن سین کا سراندیپ سے رخصت ہونا

پریشاں ہے ساقی طبیعت مری — ستاتی ہے اب مجکو وحشت مری
بس اب میکدے سے دل اکتا گیا — مرا جی بہت یاں سے گھبرا گیا
تمنّا ہے پھر اب سفر کی مجھے — ستاتی ہے اب یاد گھر کی مجھے
روانہ وہ خط کر چکا جب ادھر — تو پھر کر دیا اس نے قصد سفر
کیا پدمنی نے یہ ماں سے بیاں — یہ سنکر ہوئی غم سے وہ نیم جاں
ہوئی بدحواس ایسی گھبرا کے وہ — لگی کہنے راجہ کو بلوا کے وہ
کہ پدماوتی تو یہاں سے چلیں — خفا ہو کے میرے مکاں سے چلیں
رتن سین گھر ان کو لیکر چلے — ہمیں داغ فرقت کا دیکر چلے
بہت منتشر وہ بھی سُن کر ہوا — بہت ہی اثر اس کے دل پر ہوا
رتن سین کو پھر بلا کر کہا !! — یہ سینے سے اپنے لگا کر کہا
کہ بیٹا چلے کیوں یہ منھ موڑ کر — چلے کس پہ یہ سلطنت چھوڑ کر
قلق تم کو اس سلطنت کا نہیں — کوئی وارث اس مملکت کا نہیں
بھلا سلطنت یہ سنبھالے گا کون — یہ کل کام اب دیکھے بھالے گا کون

رتن سین یہ سن کے رونے لگا — وہ رو رو کے جان اپنی کھونے لگا
کہا گھر ضروری ہے جانا بہت — گیا ہے گزر اب زمانا بہت
بہت دن سے پائی نہیں کچھ خبر — خدا جانے واں کیا گئی ہو گزر
مجھے گھر کو جانے کی رخصت ملے — خوشی سے مجھے اب اجازت ملے
اگر زندگی ہے تو پھر آؤں گا !! — پھر آ کر یہ صورت دکھا جاؤں گا
یہ سُن کر نہ کچھ اس سے وہ کہہ سکا — خوشی سے اُسے کی اجازت عطا
اسی دن سے رونق گئی شہر کی — رہی وہ نہ دلبستگی شہر کی
اداسی برسنے لگی شہر میں — بسی آ کے افسردگی شہر میں
عیاں جب شبِ صبحِ فرقت ہوئی — تو ہر سمت برپا قیامت ہوئی
یہ عالم تھا شبنم سے روتی تھی رات — منہ اشکوں سے رو رو کے دھوتی تھی رات
ستاروں پہ تھا چشمِ تر کا گُماں — چراغوں پہ داغِ جگر کا گُماں
جدھر دیکھیے غم کا عالم ادھر — جدھر جائیے حسرت و غم اُدھر
فلک کو ندامت تھی قاتل کی طرح — چمکتے تھے تارے بجھے دل کی طرح
مکانوں میں شمعیں پریشاں کبھی — کبھی آہ کش اشک افشاں کبھی
بڑے غم میں راجہ گرفتار تھا — ہزاروں جگہ شق دلِ زار تھا
ذرا بھی نہ لیتا تھا دم دردِ ہجر — بڑا کر رہا تھا ستم دردِ ہجر
کبھی دل میں چمکا جگر میں کبھی — جگر سے وہ پہنچا کمر میں کبھی
تلاطم قیامت کا تھا قصر میں — بڑا جوش رقت کا تھا قصر میں
کسی کو نہ اس شب تھا سونے سے کام — جسے دیکھیے اس کو رونے سے کام
بہت ہی بُرا حال رانی کا تھا — بڑا زور دردِ نہانی کا تھا
تڑپتی تھی وہ مرغِ بسمل کی طرح — اسے چین دم بھر نہ تھا دل کی طرح
سر اپنا زمیں پہ پٹکتی تھی وہ — کلیجے کو پکڑے یہ بکتی تھی وہ
کہ اب ہو چکی زندگانی مری — جہاں سے گئی شادمانی مری

بڑا تو نے دھوکا دیا پدمنی — مرے ساتھ یہ کیا کیا پدمنی

کہاں روٹھ کر مجھ سے پیاری چلی — کدھر ہائے تیری سواری چلی!

دیا مجکو داغ جگر کس لئے! — اُجاڑا مرا تو نے گھر کس لئے

ہوئے ظاہر اتنے میں آثار صبح! — کھُلا گیسوئے شب سے رخسار صبح

رتن سین نے اپنی باندھی کمر — کہ ساعت تھی رخصت کی وقت سحر

وہ بت رخصت اک اک سے ہونے لگی — گلے مل کے سب سے وہ رونے لگی

عجب غم کا اس وقت سامان تھا — جسے دیکھئے وہ پریشان تھا

در قصر پر مجمع عام تھا — قیامت کا اس وقت کہرام تھا

یہ کہتے تھے سب پدمنی بھی چلی — جو رونق سراندیپ کی تھی چلی

بسا تھا جو گھر وہ اجڑتا ہے آج — بنا شہر کیسا بگڑتا ہے آج

سنبھالے گی دل اس کی ماں کس طرح — جئے گی وہ اب نیم جاں کس طرح

ہوئی اتنے میں وہ گل تر سوار — چلی خون روتی ہوئی دل فگار

گری ہو کے بیہوش ماں خاک پر — گیا دل الٹ، ہو گیا شق جگر

جہاں تک تو خشکی کا تھا راستا — چلا آیا باپ اس کا روتا ہوا

ہوئے جب سوار اور چلا وہ جہاز — تو اس کا بڑھا یوں غم جانگداز

کہ وہ گر پڑا تھام کر دل وہیں — تڑپنے لگا شکل بسمل وہیں

گیا ٹوٹ دل کم نظر ہو گئی — ہوا غم وہ دہری کمر ہو گئی

پکارا چلے میرے پیارو کدھر — چلے میری آنکھوں کے تارو کدھر

چلے تم ہمیں نیم جان چھوڑ کر — چلے تم ہماری کمر توڑ کر

تمہارا نگہباں خُدا ہر گھڑی — وہی حافظ و رہنما ہر گھڑی

چلا الغرض واں سے کھل کر جہاز — اٹھا کر بڑھا اپنا لنگر جہاز

چلے واں سے دونوں بڑی شان سے — بڑے کروفر اور سامان سے

چلے کچھ جوانان لشکر بھی ساتھ — ہوئے چیدہ چیدہ کچھ افسر بھی ساتھ

خواصیں بھی ساتھ اس حسیں کے تھیں سب — وہی کل تھا سامانِ عیش و طرب

چلے منزلیں طے وہ کرتے ہوئے — چلے دم سفر کا وہ بھرتے ہوئے

رتن سین کا طوفان میں آجانا

نہ کر ساقیا دیر ساغر اُٹھا — اٹھا کشتیِ مے کا لنگر اُٹھا

بڑے جوش پر مے کا دریا ہے آج — ہر اک لہر موجوں پہ کیا کیا ہے آج

بط مے ہے کیا تیرتی ہر طرف — گھٹا بھی ہے کیا اٹھ رہی ہر طرف

دکھا دے وہ دریا دلی تو بھی آج — کہ رہ جائے حسرت نہ کچھ دل کی آج

کہیں مے کی کشتی نہ چل کر رُکے — نہ شیشہ رُکے اور نہ ساغر رُکے

چلا جب رتن سین سوئے وطن — اسے لے چلی آرزوئے وطن

تو اک روز اک شہر آیا نظر — گیا واں جہاز ان کا آکر ٹھہر

لبِ ساحل اب اس کا خیمہ پڑا — کہ موقع تھا وہ لطف افزا بڑا

کئی دن رہا وہ اقامت گزیں — پسند آگئی اسکو وہ سرزمیں

ہوئے واں کے ملاح یہ خواستگار — کہ اس بات کے ہم ہیں اُمیدوار

کہ سیر ایک منظر کی کرلیں حضور — چلیں سیر کرتے ہوئے تھوڑی دور

یہ منظر اُدھر ہے بہت دلکشا — اٹھائیں گے سرکار پورا مزا

سوا اسکے ہے خوب بجرا سجا — زمانہ بھی ہے ایک کمرا سجا

ہوا اس کے مشتاق وہ ذی وقار — ہوا پدمنی کو وہ لیکر سوار

فقط آپ تھا اور وہ نازنیں — خواصیں بھی ہمراہ اسکے نہ تھیں

وہ بجرا کھلا ان کو لیکر چلا — بڑے لطف سے سوئے منظر چلا

بجے چار تھے اب نہ دن تھا سوا — بڑی لطف سے چل رہی تھی ہوا

سمندر مگر زور پر تھا بہت — ہر اک موج تھی شور افزا بہت

تردد سے یہ سیر خالی نہ تھی — یہ تفریح وہ روز والی نہ تھی

بالآخر یہی ان کو آیا نظر!!
غبار آیا اک سمت چھایا نظر

یہ اثر سے آندھی کا طوفاں اُٹھا
کہ ہر دل سے دود پریشاں اُٹھا

پریشان سب ناخدا ہو گئے
اڑا رنگ چہروں سے گھبرا گئے

سمندر میں ایسا تلاطم ہوا
کہ آیا ہوا ہوش بھی گم ہوا!

ہر اک کے بدن کا لہو گھٹ گیا
دلوں کی طرح بادباں پھٹ گیا

وہ بجرا جو تھا خشک تپا ہوا
گیا نیچے پھر اوٹھ کے اونچا ہوا

تباہی میں آخر وہ پڑ ہی گیا
کسی کوہ سے جا کے لڑ ہی گیا

ہوا ٹکڑے ٹکڑے جگر کی طرح
گئے ڈوب وہ سب گہر کی طرح

وہ فرحت وہ صحبت ہوئی برطرف
رواں تختہ تختہ ہوا ہر طرف

وہ بُت ایک تختے پہ بہتی ہوئی
اذیت سمندر کی سہتی ہوئی

کنارے بہت دُور جا کر لگی
مگر اک جزیرے میں آ کر لگی

وہ ٹاپو تھا اک مرد درویش کا
عمل تھا وہاں اس صفا کیش کا

بڑا حق پرست اور طاعت گزار
بڑا متقی اور شب زندہ دار

ہر اک شے کو دل سے بھلائے ہوئے
خداکیطرف لو لگائے ہوئے

مکاں اپنا تھا وہ بنائے وہیں
اسیکے تعلق تھی وہ سر زمیں

وہ رکھتا تھا اک دختر عابدہ
بڑی پارسا صالحہ، ساجدہ

لب ساحل اس روز آئی تھی وہ
پئے سیر تشریف لائی تھی وہ

ٹہلتی تھی، ہمجولیوں کو لئے
دل اپنا تھی اس سیر کو وہ دیے

وہ لُطف طرب خیز دمساز شام
وہ دن کی تمامی وہ آغاز شام

وہ ٹھنڈی ہوائیں وہ پانی کا لطف
وہ پانی کی دلکش روانی کا لُطف

یہ اتنے میں پانی میں آیا نظر
کوئی شے چمکتی ہے آتی ادھر

کہا اس نے دیکھو چمکتا ہے کیا
یہ رہ رہ کے ہر دم جھلکتا ہے کیا

وہ حیرت میں آئیں اُسے دیکھ کر
کہا کام کرتی نہیں ہے نظر

خدا جانے یہ جلوہ افگن ہے کیا — یہ اس وقت پانی میں روشن ہے کیا
یہ اتری کوئی حور پانی میں ہے — کہ یہ جلوۂ طور پانی میں ہے
یہ سورج تو پانی میں اُترا نہیں — مگر وہ تو تابندہ اِتنا نہیں
گیا دن گزر ہو گئی رات کیا — نکلتا ہے کیا چاند ہے بات کیا
اس اثنا میں وہ شے قریب آ گئی — کنارے وہ بہتی ہوئی آ لگی
بڑھیں وہ کہ دیکھیں تو کیا چیز ہے — یہ کون ایسی جلوہ نما چیز ہے
گئیں تو وہ شے انکو آئی نظر — جسے دیکھ کر تلملائی نظر
کوئی حور اس کو بتانے لگی — پری ہے یہ شرط اک لگانے لگی
کہا اک نے احمق ہو انسان ہے — مگر ہائے افسوس بے جان ہے
کہا ایک نے جان تو ہے ابھی — کوئی دَم کی مہمان تو ہے ابھی
وہ سردار بولی نکالو اسے — جو جان اسمیں ہے تو سنبھالو اسے
نہ عرصہ کرو خیر کا کام ہے — کوئی شاہزادی یہ گلفام ہے
غرض سب نے مِل کر نکالا اسے — لٹا کر زمیں پر سنبھالا اسے!
وہ سب اس کی حالت پہ رونے لگیں — فِدا اس کی غربت پہ ہونے لگیں
وہ جلدی سے دیتیں اُسے کیا اڑھا — دوپٹا دیا اپنا اپنا اڑھا
اُسے دیر تک وہ دبائے رہیں — کلیجے سے اپنے لگائے رہیں
تنزل پہ بارے وہ حالت ہوئی — ٹھکانے کچھ اس کی طبیعت ہوئی
گئی اُٹھ کے بیٹھ ایک حیرت کے ساتھ — لگی تکنے منہ سب کا حسرت کے ساتھ
نظر آئیں کچھ اجنبی عورتیں — قریب اپنے دیکھا نئی عورتیں
لگی رو کے کہنے ہے راجہ کدھر — خواصیں بھی آتی نہیں ہیں نظر
پڑی ہوں میں آ کر یہاں کسطرح — یہ تم مجکو گھیرے ہو کیوں اسطرح
وہ روئیں بیاں اس کا سنکر بہت — لگی چوٹ ان سب کے دل پر بہت
انھیں اور بھی یہ یقیں ہو گیا — کوئی شاہزادی ہے یہ مہ لقا

وہ سردار بولی نہ گھبرائیں آپ ‏ ‏ کچھ احوال تو ہم سے بتلائیں آپ

کہ کس طرح اپنے مکاں سے چھٹیں ‏ ‏ ہوا کیا یہ کیوں باپ ماں سے چھٹیں

بیاں رو کے حال آخر اس نے کیا ‏ ‏ جو گزرا تھا اس پر وہ ظاہر کیا

کہا تم نے مجکو نکالا عبث ‏ ‏ گزر جانے دیتیں سنبھالا عبث

جو زندہ ہی میرا وہ پیارا نہیں ‏ ‏ تو مجھکو بھی جینا گوارا نہیں

اب اس زندگانی کو میرا سلام ‏ ‏ مری نوجوانی کو میرا سلام

یہ کہہ کر وہ پژمردہ گل کی کلی! ‏ ‏ سمندر میں پھر ڈوبنے کو چلی

گئیں وہ لپٹ دوڑ کر سب اُسے ‏ ‏ چلیں لیکے اپنے وہ گھر سب اُسے

اُسے لائیں گھر قدر و عزت کیساتھ ‏ ‏ لگیں کرنے خدمت محبت کے ساتھ

پر اس کی طبیعت سنبھلتی نہ تھی ‏ ‏ وہ پھانس اسکے دل سے نکلتی نہ تھی

ترقی پہ تھا اس کا غم ہر گھڑی ‏ ‏ کھٹکتا تھا کانٹا سا دم ہر گھڑی

ترقی یہاں تک وہ غم پا گیا ‏ ‏ کہ غش روتے روتے اسے آ گیا

گیا دم الٹ ہچکیاں بندھ گئیں ‏ ‏ پھریں پتلیاں مٹھیاں بندھ گئیں

وہ رونے لگیں ہو گئے سب منتشر ‏ ‏ کہ یہ تو سنبھل کر چلی ہائے پھر

یہ بیٹی نے بھیجی خبر باپ کو ‏ ‏ کہ لازم ہے لینی خبر آپ کو

نکلتی ہے جان اک پریشان کی ‏ ‏ بچا لیجئے جان مہمان کی!!

وہ درویش آیا اُسے دی دُعا ‏ ‏ گئی اٹھ کے پھر بیٹھ وہ مہ لقا

پھر اس کا وہ احوال کر کے نظر ‏ ‏ دُعا کی کہ اے خالقِ بحر و بر

جو بچھڑے ہیں ان سے ملادیں انھیں ‏ ‏ اگر مر گئے ہوں جلادیں انھیں

تجھے میرے خالق ہے طاقت بڑی ‏ ‏ بڑی تجھ میں قوت ہے قدرت بڑی

کب اجڑے ہوئے گھر بسائے نہیں ‏ ‏ کہاں ڈوبے بیڑے ترائے نہیں

غم و رنج میں آڑے آتا ہے تو ‏ ‏ ہر اک کو ٹھکانے لگاتا ہے تو

الٰہی انوکھی ہے قدرت تری ‏ ‏ اگر جوش پر آئے رحمت تری

تو پتھر سے پانی اُبلنے لگے | جو رہتی بھی ہوناؤ چلنے لگے
قبول اس کی بارے دُعا ہو گئی | قبول اس کی وہ التجا ہو گئی
بڑھا اس کی رحمت کا دریا وہیں | رتن سین بھی بہہ کے پہونچا وہیں
جہاں پدمنی کا تھا تختہ لگا | وہیں یہ بھی بہتا ہوا آ لگا
معاً واں سے اسکو اٹھالائے لوگ | لئے پاس درویش کے آئے لوگ
وہ درویش پہچان اسکو گیا | وہ اچھی طرح جان اسکو گیا
جو سنبھلا وہ کچھ تب یہ اس سے کہا | کہ بیٹا نہ کر دل میں تو غم ذرا
وہ گل تو مرے گھر میں مہمان ہے | مرا گھر کا گھر اس پہ قربان ہے
وہ یہ سن کے منہ اس کا تکنے لگا | کہ مجھ سے یہ درویش کہتا ہے کیا
خبر اس کی جس وقت اندر ہوئی | جو آگاہ وہ حور پیکر ہوئی
تو مارے خوشی کے وہ گھبرا گئی | تڑپ کر در قصر پر آ گئی!
جو وہ با خدا اس سے ماہر ہوا | تو وہ خود اسے لیکے حاضر ہوا
نظر کرکے باہم وہ رونے لگے | وہ پھر جانیں رو رو کے کھونے لگے
کہا تب تم چپ ہو خدا کے لئے | نہ اب روؤ تم کبریا کے لئے
جگہ اب تمہیں خوش یہ ہونے کی ہے | کہ بیتاب ہو ہو کے رونے کی ہے
غرض انکے دل کا وہ غم مٹ گیا | وہ صدمہ مٹا وہ الم مٹ گیا
وہ لشکر وہ کل اسکی فوج و سپاہ | یہیں آ کے پہنچے بحال تباہ
بڑی قدر کی ان کی درویش نے | خوشی کی بڑی اس صفا کیش نے
بہت روز مہمان رکھا انھیں | دکھایا وہ منظر وہاں کا انھیں
وہ درویش کی دختر پارسا | بہت ہی ہوئی پدمنی پر فدا
وہ چلنے کے وقت انکے تڑپی بہت | جدائی نے کلفت انہیں دی بہت
کڑھا ان کی فرقت میں درویش بھی | ہوا مضطرب وہ صفا کیش بھی
بڑی قدر کے ساتھ رخصت کیا | بہت اسنے دل سے انھیں دی دُعا

چلے وہ سفر روز کرتے ہوئے
بہر ک راستے سے گزرتے ہوئے

بہت جلد پہنچے وطن کے قریب
گئے جاگ اس ملک کے پھر نصیب

چلے لوگ لینے مسرت کے ساتھ
بڑھے پیشوائی کو شوکت کیساتھ

وہ گھر اپنے آیا بڑی شان سے
بڑے ٹھاٹھ سے اور سامان سے

اسی طرح داخل وہ بُت بھا ہوئی
سواری وہ ڈیوڑھی پہ آکر رُکی

اٹھی ساس دوڑی بشاشت کیساتھ
اتارا بہو کو مسرت کے ساتھ

تحیر میں سب آگئیں دیکھ کر!!
بلائیں لگیں لینے سب کی نظر

بڑی ناگمت کو ندامت ہوئی
بہت اسکو اسدم خجالت ہوئی

بہت جھینپی غیرت سے کٹ کٹ گئی
مقابل سے اس حور کے ہٹ گئی

غرض پھر خوشی کے وہ دن آگئے
وہ دن اپنے سب لوگ پھر پا گئے

خوشی کے بجے شادیانے تمام
لگے اس کو دینے دُعا خاص و عام

سوا حد سے بھی دل میں ماں خوش ادھر
اور اس سے سوا ناگمت خوش ادھر

ناگمت کا اپنے باغ میں سیر کو جانا اور پدماوت کو بھی بلوانا

پلا جلد ساقی کہ آئی بہار
خوشی پھر بڑی ساتھی لائی بہار

ہوائیں پھر اٹھلا کے چلنے لگیں
نئی کونپلیں پھر نکلنے لگیں

لگے پھولنے پھول گلشن میں پھر
جما رنگ پر رنگ گلشن میں پھر

کوئی ناگمت کا تھا واں خاص باغ
وہ دیتا تھا دنیا کے باغوں کو داغ

اسی میں کسی روز وہ پھول تھی
گلوں کے تماشے میں مشغول تھی

سماں اس نے دیکھا گلوں کا کبھی
سُنا چہچہا بلبلوں کا کبھی

فدا تھی دل و جاں سے گلزار پر
نظر اس کی تھی ایک اک خار پر

بہاروں پہ واقع میں گلزار تھا
رگ گل سے بہتر تھا جو خار تھا

بہار اپنی ہر دم دکھاتے تھے پھول
اداؤں سے دل کو لبھاتے تھے پھول

معطر تھی ایسی چمن کی ہوا
کہ نادم تھی دشت ختن کی ہوا

کہیں کوک کوئل کی تھی آرہی
کہیں مور کی تھی صدا چھا رہی

عجب لطف کے دن عجب فصل تھی
جو ساعت تھی وہ طالب وصل تھی

پپیہے تھے قہر اور ڈھائے ہوئے
بڑا غل تھا باہم مچائے ہوئے

لگاتے تھے دل پر وہ گویا سنان
وہ کہتے تھے جب پی کہاں پی کہاں

بہم کبک کرتے تھے شور اک طرف
منڈیروں پہ رقصاں تھے مور اک طرف

ہوئی ناگہت شاد حد سے سوا!
چمن وہ بہت ہی مزہ دے گیا!

خواصوں سے بولی کہ کیا باغ ہے
جہاں میں یہ کیا پُر فضا باغ ہے

دلآویز یہ باغ ہے جس طرح
جہاں میں نہ ہوگا کہیں اس طرح

وہ بولیں کہ شک اسمیں ہے کیا حضور
نہیں باغ دُنیا میں ایسا حضور

جہاں بھر کے باغوں کی یہ جان ہے
اسی پر تو فردوس قربان ہے

ہوئی خوش یہ سن کر انیسوں سے وہ
یہ کہنے لگی ان جلیسوں سے وہ

دکھانا تھا اسکو تو سوکن کو بھی
جلانا تھا اس اپنے دشمن کو بھی

یہاں سے کوئی جا کے لائے اُسے
یہ پیغام میرا سُنائے اسے

کہ گر ہرج یاں تک نہ آنے میں ہو
نہ وقت جو تشریف لانے میں ہو

تو تشریف گلزار میں لائیے ؟
مجھے آکے ممنون فرمائیے

کہا خادمہ جو جا کر پیام
ہوئی شاد سُن کر وہ محشر خرام

ہوئی جلد طیار وہ گلعذار
چلی سیج گاڑی پہ ہوکر سوار

جو پہونچی وہاں جا کے یہ مہ جبیں
تو دل میں ہوئی شاد وہ نازنیں

اُسے باغ اپنا دِکھانے لگی
ادھر اور ادھر لے کے جانے لگی

کبھی لے گئی اس روش پر اُسے
کبھی اس پہ پہونچی وہ لیکر اسے

دم اس باغ کا خود ہی بھرنے لگی
خود اس طرح تعریف کرنے لگی

کہ اس باغ کا آج ہمسر نہیں
کوئی باغ اس کے برابر نہیں

یہ سنکر وہ گل مسکرانے لگی
ہنسی اس کا دل گدگدانے لگی

کہا تم کو کہنا یہ زیبا نہیں
کوئی باغ ابھی تم نے دیکھا نہیں

جہاں میں ہیں وہ وہ شگفتہ چمن
ہزاروں ہیں اسطرح تازہ چمن

کہ نازاں ہے جنکے گلوں پر جہاں
انھیں سے ہے سارا معطر جہاں

زمانے میں کیا ہے فصل گل آج کل
شگفتہ ہیں گلزار کل آج کل

جو گلشن ہے اس کا یہی حال ہے
گل ولالہ سے ہر چمن لال ہے

سراندیپ میں جو مرا باغ ہے
عجب پر فضا دلکشا باغ ہے

مقابل اگر اسکے یہ باغ ہو
تو لالہ سا ہر پھول میں داغ ہو

مجھے سخت حیرت ہے اس بات کی
کہ مدحت سرا تم ہو کس بات کی

ستائش کے قابل تو گلشن نہیں
کسی پھول پر اس کے جوبن نہیں

یہ کیوں پیڑ اتنے ملائے گئے
گھنے اس قدر کیوں لگائے گئے

یہ بے میل ہر ایک تھالا ہے کیوں
یہ سوسن کے تختے میں لالہ ہے کیوں

یہ جوہی الگ کیوں لگائی گئی
نواڑی یہ کیوں واں ہٹائی گئی

چنبیلی یہاں اور بیلا وہاں
ہزارا یہاں اور گیندا وہاں

یہ نسریں سے ہے نسترن کیوں الگ
پڑی ہے وہاں یاسمن کیوں الگ

یہی سیب کی یاں ضرورت تھی کیا
شریفے لگانے کی حاجت تھی کیا

نہیں کوئی تختہ بری عیب سے
جو کیاری ہے وہ ہے بھری عیب سے

یہ سن کر وہ جامے سے باہر ہوئی
وہ اکبارگی خاک جل کر ہوئی

کہا رنج دینے کی گھاتیں ہیں یہ
حسد کی عداوت کی باتیں ہیں یہ

امارت نفاست کی لیتی ہو تم
یہی ہر گھڑی چھیڑ دیتی ہو تم

کبھی یوں نہ ہوگا تمہارا چمن
نہ اسطرح ہوگا سنوارا چمن

سجاوٹ کو تم جانتی ہی نہیں
چمن باغ پہچانتی ہی نہیں

یہ سُن کر ہوئی وہ بھی برہم بہت
ہوئی پر غضب وہ پری چھم بہت

کہا یہ تمہاری نہ خصلت گئی
اُلجھنے کی سب سے نہ عادت گئی

پرندے کی گو منھ کی بھی کھا چکیں
تکبر کی اپنے سزا پا چکیں

نہ اب تک مگر کچھ خجالت ہوئی
نہ دعویٰ پہ اپنے ندامت ہوئی

وہ برہم یہ سُنکر ہوئی اور بھی
وہ جامے سے باہر ہوئی اور بھی

کہا پڑھ کے مجھکو ندامت ہو کیوں
مجھے اپنے دعویٰ پہ خجلت ہو کیوں

مری تجھ سے کیا کم ہے صورت بُری
ملاحت بری ہے کہ رنگت بُری

تری طرح گو گوری چِٹّی نہیں!
مگر میں غضب کی ہوں ہٹی نہیں

نمک جو مرے سانولے پن میں ہے
جو جادو مری ترچھی چتوں میں ہے

تجھے حشر تک وہ میسّر نہیں
حسین کوئی میرے برابر نہیں

نہ شوخی ہو جس میں وہ عورت ہی کیا
نمک ہو نہ جس میں وہ صورت ہی کیا

نہ بھونرے ہوئے مجھ پہ عاشق تو کیا
نہ کیڑے ہوئے گر موافق تو کیا

وہ بولی کہ ہٹ ہٹ سرک دُور ہو
بہت اب نہ بیہودہ بک دُور ہو

بڑی ایک یہ حسن والی ہوئی
جہاں میں یہ سب سے نرالی ہوئی

مرا جا کے راجہ سے تو حال پوچھ
مرے حسن کا اس سے احوال پوچھ

لیا تھا یہ جوگ اُس نے تیرے لیئے
کہ پہونچا سراندیپ تیرے لیئے

زمانے میں مجھ سا حسیں کون ہے
مری طرح زہرہ جبیں کون ہے

پری سامنے میرے آتی نہیں
کبھی حور آنکھیں ملاتی نہیں

مرے آگے تیری حقیقت ہے کیا
ستارے کو ذرے سے نسبت ہے کیا

ارے میں جہاں میں عجیب چیز ہوں
نئی چیز ہوں منتخب چیز ہوں

ہزاروں میں ہے ایک صورت مری
زمانے میں ہرسو ہے شہرت مری

کٹاری سے بڑھ کر نظر ہے مری
رگ گل سے نازک کمر ہے مری

غرض دونوں باہم لڑیں اسطرح
کہ ہو ہو گئیں وہ پسینے میں تر

دوپٹے بھی ڈھل کر گرے دوش پر — وہ غصے میں ہو ہو گئیں ننگے سر
گئے کھل وہ گوندھے ہوئے بال بھی — ہوئے لال وہ چاند سے گال بھی
خواصیں اس احوال کو دیکھکر — چلی آئیں اس حور کو لیکے گھر
پریشاں رتن سین سُنکر ہوا — اثر ان کی رنجش کا دل پر ہوا
اسیدن کیا پھر تو اس نے یہ کام — کیا سوچ کر اس نے یہ اِنتظام
کہ دونوں کو یکجا نہ ہونے دیا — الگ کر دیا انکا راحت سرا
وہ مِل جُل کے باہم رہیں شاد پھر — وہ دونوں ہوئیں صاحب اولاد پھر
جو پدماوتی کا دلارام تھا — کنول سین اس پیارے کا نام تھا
جو تھا ناگمت کا وہ نورِ نظر — کلیجے کی ٹھنڈک قرارِ جگر
اسے راجہ نگسین کہتے تھے سب — دلارے تھے سب کے یہ عالی نسب
زمانہ اس اثنا میں بدلا بہت — ہوا رنگ تبدیل اس کا بہت
وہ توتا وفادار بھی مر گیا — جہاں سے عدم کا سفر کر گیا

وہ ماں بھی رتن سین کی چل بسی
زیادہ نہ وہ بھی رہی چل بسی

راگھو برہمن کا رتن سین کے دربار سے نکلنا اور سلطان علاؤالدین تک پہونچنا

پلانا ہے ساقی تو عرصہ نہ کر — یہ ہے کار خیر اسمیں وقفہ نہ کر
نہ باقی رہے ہوش دے اس قدر — پلا دے مجھے پی سکوں جس قدر
زمانے کا ساقی بھروسا ہی کیا — کسی چیز پہ یاں کے تکیا ہی کیا
خبر کیا ابھی مہرباں ہو گا کیا — ابھی بیٹھے بیٹھے عیاں ہوگا کیا
ہمیشہ یہی کارخانہ نہیں — برابر کسی کا زمانہ نہیں
تھے اکثر وہ بیٹھے بہت برہمن — رتن سین تھا رونقِ انجمن

کہا اس نے کل چاند یا آج ہے | وہ کہنے لگے کل ہمارا راج ہے
مگر ایک پنڈت نے تردید کی | کہ ہرگز نہیں کل ہے چاند آج ہی
یہ بحث الغرض طول یاں تک ہوئی | اور اس طرح آپس میں بک بک ہوئی
کہ قسمیں بہت اس میں کھائی گئیں | سر بزم شرطیں لگائی گئیں
یہ پنڈت بڑا تجربہ کار تھا | پرانا وہاں کا نمک خوار تھا
لیاقت کا تھا اس کی شہرہ تمام | معزز تھا عالم تھا راگھو تھا نام
ہوئی اب جو اس دن زمانے میں شام | تو اس برہمن نے کیا واں یہ کام
کہ چاند اس نے سب کو دکھا ہی دیا | ہلال آسماں پر بتا ہی دیا
وہ پنڈت بھی سب تجربہ کار تھے | نہایت ہی زیرک تھے ہشیار تھے
لگے کہنے یہ چاند اصلی نہیں | کوئی اصلیت اس چمک کی نہیں
کرشمے یہ سب سحر سازی کے ہیں | تماشے یہ جادو طرازی کے ہیں
کوئی ہٹ کے دیکھے تو معلوم ہو | ابھی تو تماشا یہ معدوم ہو
اسی وقت کچھ لوگ جاتے گئے | خبر ہر طرف سے یہ لاتے گئے
کہ ہٹ کر نظر چاند آتا نہیں | کوئی اس کو گردوں پہ پاتا نہیں
ہوا اس سے ناراض راجا بہت | کیا اس نے راگھو پہ غصا بہت
خوش آئی نہ یہ سحر سازی اسے | نہ بھائی یہ جادو طرازی اسے
دیا حکم یہ راستا لیے ابھی | نکل جائے چتوڑ گڑھ سے ابھی
وہاں سے وہ بیچارہ رو کر چلا | محل کے وہ نیچے سے ہو کر چلا
تھی کوٹھے پہ پدماوتی آ کھڑی | جھروکے کی چلمن سے تکتی وہ لگی
خواصوں نے اس کا بتایا وہ حال | جو گزرا تھا اس پر سنایا وہ حال
تأسف کیا رحم آیا اسے | جھروکے کے نیچے بلایا اسے
اور انمول پازیب وہ پاؤں کی | جھروکے کے نیچے وہیں پھینک دی
کہ شاید پڑے کچھ ضرورت اسے | کوئی پیش آ جائے حاجت اسے

ہوا تھی یہ پھینکنے میں مگر — ستم یہ گلے کے ہوا ہار یہ

کہ الجھا تو وہ ٹوٹ کر گر پڑا — گلے سے معاً چھوٹ کر گر پڑا

ستارے سے موتی بکھر کر گرے — چمکتے ہوئے سب زمیں پر گرے

انھیں دیکھ کر وہ گل تر ہنسی — کہا کہہ دو اب چن لے یہ اسکو بھی

برہمن یہ کل لیکے دولت چلا — وہ طے کرتا ساری مسافت چلا

ہوا شہر دہلی میں آکر مقیم — بحال پریشاں بحال سقیم

علاؤ الدین اسوقت تھا تاجدار — اسی کا تھا کل ہند پر اختیار

وہاں اس نے کچھ ایسی تدبیر کی — مدد کچھ ہوئی ایسی تقدیر کی

کہ پہونچا وہ دربار سلطان تک — گئی ایک چیونٹی سلیمان تک

لیاقت سے خوش اسکی سلطان ہوا — بہت اسکی صحبت سے شاداں ہوا

رفاقت جو اسکو ملی شاہ کی — تو دکھلائیں چیزیں وہ اس ماہ کی

اُسے دیکھ کر دنگ سلطاں ہوا — نفاست پہ صنعت کی حیراں ہوا

کہا یہ کہاں تجھکو دولت ملی — کہاں اس طرح تجھکو عزت ملی

نہیں یوں تو پازیب دیکھی کبھی — یہ ہے کس کے پاؤں کی کس نے یہ دی

اسی طرح موتی بھی ہیں بے بہا — یہ ہیں ہار کس کے کس نے دیا

بتایا برہمن نے احوال سب — کہا حسن کا اس کے وہ حال سب

سراندیپ راجہ کا جانا کہا — وہاں سے اُسے بیاہ لانا کہا

یہ سُن کر وہ اس پر فدا ہو گیا — فدا ہو گیا مبتلا ہو گیا

رہا دل پہ اس کا نہ کچھ اختیار — نظر آئے چلنے وہ صبر و قرار

نکل کر چلے اشک داماں کی سمت — بڑھے ہاتھ دونوں گریباں کی سمت

ہوا دل میں بحر تمنا کا جوش — رگوں میں ہوا خون سودا کا جوش

گئی عقل ساری فراست گئی — وہ خوبی گئی وہ متانت گئی

نہ سوچا نہ کچھ غور اس نے کیا — رتن سین کو اب یہ فرماں لکھا

سلطان علاؤ الدین کا فرمان

مرے مہرباں منبر سلطنت
شجاع وجری یا در سلطنت
سُنا ہے یہ تو نے کی تقریب سے
سفر کر کے شہر سراندیپ سے
کوئی نازنین ساتھ لائے ہو تم
دل اپنا اُسی سے لگائے ہو تم
بہت جلد اوسکو روانہ کرد
نہ کچھ اس میں حیلہ بہانہ کرد
نہیں تو بہت ہو گی خفت تمہیں
بہت ہو گی اس میں ندامت تمہیں
مرا حال تم جانتے یا نہیں
مری تیغ کو مانتے کیا نہیں
سپہدار ہندوستاں کا ہوں میں
شہنشاہ سارے جہاں کا ہوں میں
خدا نے وہ بخشی ہے طاقت مجھے
عطا کی ہے اس نے وہ صولت مجھے
کہ میرا کوئی آج ہمسر نہیں
کوئی آج میرے برابر نہیں
نہیں کس ولایت میں شہرا مرا
نہیں مانتا کون لوہا مرا
جو پہونچا یہ حکم اسکو سلطان کا
کھلا اُس پہ مضمون جو فرمان کا
تو غصے سے وہ تھر تھرانے لگا
رگوں میں لہو جوش کھانے لگا
ہلے ہونٹھ تیوری بدلنے لگی
نظر تیغ کی طرح چلنے لگی
کھڑے ہو گئے رونگٹے اسطرح
سپاہی سر معرکہ جس طرح
نہ باقی رہی ضبط کی اسکو تاب
معاً اسکے فرماں کا لکھا جواب

رتن سین کی عرضداشت اور سلطان علاؤ الدین کی فوج کشی

فریدوں حشم تاجدار جہاں
وحید جہاں شہریار جہاں
بہ شوکت بہ ہمت ہمیشہ رہے
سر پاک سے دُور سودا رہے
مرے نام فرمان صادر ہوا
جو مضمون تھا اسمیں وہ ظاہر ہوا

حقیقت میں حضرت شہنشاہ ہیں — جری ہیں بہادر ہیں جمجاہ ہیں
ہر اقلیم میں ہے شجاعت کی دھوم — بہت دور تک ہے عدالت کی دھوم
مگر جتنے عادل شہنشاہ ہیں — جو ذی رتبہ ہیں اور ذیجاہ ہیں
وہ اس طرح بیہودہ بکتے نہیں — شریفوں کی عزت کو تکتے نہیں
مٹا دوں گا اس بات میں آپ کو — بزرگی ہے کس بات میں آپ کو
تعلی جو اس طرح کرتے ہیں آپ — جو دم اپنی جرأت کا بھرتے ہیں آپ
ذرا بھی یہاں اس کی دہشت نہیں — کسی کو کسی پر فضیلت نہیں
یہ خط لیکے قاصد یہاں سے بڑھا — دیا اس کو اور اسنے اس کو پڑھا
وہ پڑھ کر اُسے تھر تھرانے لگا — ہوا سرخ منہ لب چبانے لگا
غرور آگ غصے کی بھڑکا چلا — بدن بھر میں چکر لہو کھا چلا
معاً اس پہ وہ فوج لیکر چڑھا — بڑے زور کے ساتھ ادھر وہ بڑھا
بڑھے واں سے مخبر خبر پاکے یہ — رتن سین کو دی خبر آکے یہ
یہاں تو یہ ہشیار بیٹھا ہی تھا — کمر باندھے طیار بیٹھا ہی تھا
خبردار ہشیار افسر ہوئے — جوانوں کے پہرے مقرر ہوئے
ہوئے جمع سارے جواں قلعہ کے — لگے صاف ہونے مکاں قلعہ کے
لگے پھرنے وہ جنگجو ارد گرد — بچھایا گیا گوکھرو ارد گرد!
ترم بوق فوجوں میں بجنے لگے — بڑی چوب ڈنکے گرجنے لگے
یہی دل میں ہر ایک کے آرزو — کہ آتا ہے تو جلد آئے عدو
توقف انہیں شاہ کا شاق تھا — جو تھا اس سے لڑنے کا مشتاق تھا
خبر اس کی جس روز آنے کی تھی — نہ حد پیچ و تاب اُنکے کھانے کی تھی
چڑھے صبح سے قلعہ کی چھت پہ تھے — مسلح تھے نازاں شجاعت پہ تھے
لڑیں آنکھیں اک اک کی تھیں راہ سے — یہی دھن مقابل ہوں اب شاہ کے
وہیں رونق افروز راجا بھی تھا — انھیں سب میں وہ حکم فرما بھی تھا

نظر واں سے کوسوں کی آتی تھی چیز
کہیں کوئی چھپنے نہ پاتی تھی چیز

مخاطب تھا ان غمگساروں سے وہ
یہ کہتا تھا سب جاں نثاروں سے وہ

کہ اب تک نہ شہ کی خبر آئی کچھ
نہ فوج اس کی ابتک نظر آئی کچھ

خبر کے موافق تو آنا تھا آج
شہنشاہ کو منھ دکھانا تھا آج

پہونچنے میں عرصہ ہوا کس لیئے
سبب کیا یہ وقفہ ہوا کس لیئے

وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا ابھی
ہوا تھا نہ یہ ذکر پورا ابھی

کہ ڈنکے کی آواز آنے لگی
ترنم کی صدا آکے چھانے لگی

نشاں فوج اول کا آیا نظر
علم وہ ہراول کا آیا نظر

زرافشاں پھریرا دکھائی دیا
وہ بادل سنہرا دکھائی دیا

لگے کہنے سب لو وہ فوج آگئی
وہ ٹیڑی سی میداں میں چھا گئی

گیا بیٹھ کرسی پہ راجا وہیں
ہوا وہ بھی محو تماشا وہیں

بڑے ٹھاٹھ سے آرہی تھی یہ فوج
بڑا رعب دکھلا رہی تھی یہ فوج

مسلح تھے سارے پیادہ سوار
پیادے مگر کم زیادہ سوار

سبھی خاکی وردی میں تھے سب جواں
شجاعت تھی چہروں سے سب کے عیاں

چلے آرہے تھے اکڑتے ہوئے
برابر قدم سب کے پڑتے ہوئے

اسی سمت اسی رخ نظر سب کی تھی
نظر قلعۂ و قصر پر سب کی تھی

نظر آتے تھے اچھے اچھے علم
بہت سے نشاں تھے بہت سے علم

مگر سب کے سب مختلف رنگ کے
نئی وضع کے اور نئے ڈھنگ کے

جو اک ایک تھا فوج کے بیچ میں
اُسے فوج تھی سب لیئے بیچ میں

نظر آرہا تھا توانا بہت
جھلک کہتی تھی ہے یہ دانا بہت

حسیں اس کا گھوڑا سوا سب سے تھا
وہ گھوڑوں میں اونچا سوا سب سے تھا

مناسب تھی پوشاک اس کی بہت
چمکتی تھی شملے کی کلغی بہت

جو ٹھاٹھ اسکے دیکھے رتن سین نے
تو پوچھا کسی سے رتن سین نے

کہ یہ بیچ والا جواں کون ہے   یہ سب سے نرالا جواں کون ہے
کہا اس نے افسر یہ جرار ہے   یہ فوج ہرادل کا سردار ہے
عیاں اتنے میں اک نشاں پھر ہوا   ہر اک سمت جلوہ نشاں پھر ہوا
علم خوشنمائی میں یہ فرد تھا   پھریرا جو اس کا تھا وہ زرد تھا
یہ تھی دوسری فوج سلطان کی   بڑی رعب کی اور بڑی شان کی
سپاہی جو اس میں تھا مغرور تھا   بہادر تھا ساونت تھا سور تھا
شجاعت تھی ہر ایک کے ساتھ میں   سپر دوش پر تیغ کیں ہاتھ میں
دلیری میں یہ فوج بھی فرد تھی   ملی وردی اس فوج کو زرد تھی
جواں ایک تھا جو نشاں کے تلے   وہ تھا ایک ہی آسماں کے تلے
بڑی شان پر اور رُتبے پہ تھا   سوار ایک چالاک سبزے پہ تھا
رتن سین سے سب بتانے لگے   یہ حال اس جواں کا جتانے لگے
کہ بیٹا یہ دستورِ اعظم کا ہے   یہ سلطاں کا ہمراز ہر دم کا ہے
نشاں اک نمودار پھر ہو چلا   پھریرا ضیا بار پھر ہو چلا!!
علم تھا یہ سُرخ اور بڑی شان کا   بڑے ٹھاٹھ کا اور سامان کا
یہ سلطان کی تیسری فوج تھی   بڑی نامور تھی فلک اوج تھی
سوار و پیادہ کی وردی تھی لال   وہ طرہ تھا لال اور بتی تھی لال
مقرر تھے اس میں دلاور کئی   دکھائی دیے اس میں افسر کئی
ہر افسر تھا جرأت شجاعت میں فرد   وجاہت میں فرد اور صورت میں فرد
قوی دیو ہیکل زرہ پوش سب   سروہی بکف گرز بر دوش سب
مخاطب ہوئے سب راجا سے پھر   لگے کہنے اس حکم فرما سے پھر
یہ ساماں ہے دستور ذیجاہ کا   وزیرِ مشیر شہنشاہ کا !!
مزے کا سماں پھر دکھائی دیا   بڑا اک نشاں پھر دکھائی دیا
پھریرا سنہرا جھلکنے لگا   وہ اڑ اڑ کے ہر دم چمکنے لگا

یہ سارے نشانوں سے تھا سربلند   جوانوں کی ہمت سے بڑھکر بلند
پھریرا کہ بجلی کی تصویر تھا   یہ اس پر جلی خط میں تحریر تھا
کہ نصر من اللہ فتح قریب   شہنشاہ عالم کو نصرت نصیب
لگی آنے شہنا کی پیاری صدا   چلی بڑھ کے ڈنکے کی بھاری صدا
گرجنے کی آواز آنے لگی   صدا طبل جنگی کی چھانے لگی
یہ تھی فوج جو تھی شہنشاہ کی   یہ عاشق تھی مشہور جنگاہ کی
ہجوم اس میں حبشی سواروں کا تھا   بڑا غول ان نامداروں کا تھا
نہ ملتی تھی تیغوں سے انکی پناہ   یہ پہنے ہوئے وردیاں تھی سیاہ
سوار ہی ہیں تھے سب کی مشکی سمند   غضب کی دکھاتے تھے شوخی سمند
جو حبشی تھا بچہ تھا وہ دیو کا   جو اب ایک اک رستم و گیو کا
تنومند ملیے گراں ڈیل سب   بھرے زور میں صورت پیل سب
کسے خوشنما پیٹیاں سب کے سب   لگائے ہوئے کلغیاں سب کے سب
بھرے سب کے سب زور میں تا تیں   سناں ہاتھ میں تیغ کیں ڈاب میں
لگی تیغ ہر اک کے پہلو سے تھی   شجاعت عیاں دست و بازو سے تھی
انھیں سب جوانوں میں سلطان بھی تھا   انھیں دلبروں میں وہ سلیماں بھی تھا
ڈٹے ترکمانی جواں ارد گرد   سپر تیغ برچھی سناں ارد گرد
لئے اپنے سائے میں تھا چتر زر   نہ ہوتا تھا سر سے جدا چتر زر
سوار ایک چالاک شبدیز پر   سبک رو سبک تر سبک چتر پر
وہ تاج اس کی پوشاک کی جان تھا   وہ عالم تھا سورج بھی قربان تھا
چلا آرہا تھا مسرت کے ساتھ   بڑی شان و شوکت شجاعت کے ساتھ
جو اس قلعہ کے آگے میدان تھا   فلک جسکی وسعت پہ قربان تھا
وہ سب بھر گیا لشکر و فوج سے   فلک دب گیا فوج کی اوج سے
جو سلطان کی فوج سب آچکی   کئی کوس کے گرد میں چھا چکی

تو راجہ بھی طیار ہو کر اُٹھا — شہنشہ سے بیزار ہو کر اُٹھا

بڑا ایک دربار آ کر کیا — فراہم ہر اک کو بُلا کر کیا

رسالوں کے افسر بلائے گئے — شجاع و دلاور بلائے گئے

کہا ان سے راجہ نے الفت کے ساتھ — یہ تقریر کی ایک حسرت کے ساتھ

کہ شہ لینے آیا ہے عزت مری — مٹانے یہ آیا ہے حرمت مری

سو میں جان دینے کو طیار ہوں — بہت ظلم سے اسکے بیزار ہوں

لڑوں گا میں خود اس سے جی کھول کر — سر فوج ہی سر معرکہ تول کر

یہ سُنکر ہوئے پرغضب راجپوت — چبانے لگے ہونٹ سب راجپوت

لیا کھینچ تلوار کو میان سے — کیا عرض حاضر ہیں ہم جان سے

مہاراج میدان میں جائیں گے کیوں — یہ تکلیف ناحق اٹھائیں گے کیوں

یہ کہلاتے ہیں مرد ہم کس لئے — حضور اس کا کرتے ہیں غم کس لئے

ہم ان ترک کو کچھ سمجھتے نہیں — الجھتے ہیں ہم جب سُلجھتے نہیں

سمجھتے نہیں ہم یہ سلطان ہے کیا — یہ انبوہ ہے کیا یہ ساماں ہے کیا

جو تلوار کھینچیں گے ہم میان سے — تو سب بھاگ جائیں گے میدان سے

ڈرے ہیں کسی سے کہیں راجپوت — جو کوئی بچے تو نہیں راجپوت!

رتن سین یہ سُن کے شاداں ہوا — سر بزم ان کا ثناخواں ہوا

کچھ اتنے میں حاضر ہوئیں لونڈیاں — لئے کشتیوں میں وہ تھیں کلغیاں

انھیں کر کے تقسیم سب سے کہا — کہ یہ پدمنی نے تمہیں ہے دیا!

کہ میری طرف سے یہ لیں راجپوت — جگہ اپنے شملے میں دیں راجپوت

بچائیں شہنشہ سے عزت مری
نہ کم سمجھیں اپنے سے حرمت مری

رتن سین اور سلطان علاؤالدین کی جنگ

پلا جلد اے ساقی مہرباں — کہ رنگ اب بدلنے پہ ہے آسماں
لہو تیری غفلت پہ پینا پڑا! — ہمیں ہائے مر مر کے جینا پڑا
تری ابتو غفلت بہت بڑھ گئی — یہ کچے گھڑے سے کی بری چڑھ گئی
اٹھ اب مے وہ دے جس سے طاقت بڑھے — عوض نشہ کے میری ہمت بڑھے
جو دربار سے آئے گھر راجپوت — لگے تکنے راہ سحر راجپوت
یہی فکر تھی اب سحر جلد ہو — رواں اپنی تیغ دو سر جلد ہو
ہوئی بارے کچھ کچھ عیاں صبح جنگ — لگی ہونے جلوہ فشاں صبح جنگ
بہادر لگے جھومنے جوش میں — لگے تیغ کو چومنے جوش میں
نکل کر وہ سب سوئے میداں چلے — بہت شاد و بشاش و خنداں چلے
نشاں لیکے اول ہراول بڑھے — یہی فوج میں سب سے اول بڑھے
نہ کم اس طرف [illegible] بھی سامان تھا — وہ سامان تھا ننگ سلطان تھا
جو آگے تھی فوج اس کی وردی تھی لال — وہ سر پیچ تھا لال، پتی تھی لال
سجا ہر سپاہی تھا ہتھیار سے — مسلح سناں اور تلوار سے
توانا تھا اس میں کا افسر بڑا! — بڑا زور آور دلاور بڑا!
بہادر تھا جاں باز جرار تھا — لگائے ہوئے پانچوں ہتھیار تھا
سواری میں گھوڑا بڑا جاندار — بڑا چست و چابک بڑا شاندار
بہت سے مسلح سوار اسکے گرد — جمائے صفیں نیزہ دار اسکے گرد
جو اس فوج کے بعد جاتی تھی فوج — دم جنگ آفت وہ ڈھاتی تھی فوج
جواں تھے جو اس میں وہ جرار سب — لگائے ہوئے تھے وہ ہتھیار سب
سروہی کمر سے لٹکتی ہوئی — وہ شملے میں کلغی چمکتی ہوئی
گلابی جوانوں کی تھیں وردیاں — بہت ہی سجی سر پہ تھیں کلغیاں

ہزاروں میں اک اسکا سردار بھی — دلاور بھی بانکا بھی جرار بھی
ہزاروں زرافشاں نشاں اسکے گرد — علم بیرق و جھنڈیاں اسکے گرد
جو تھی قطب کی وہ بڑی فوج تھی — کئی بار کی وہ لڑی فوج تھی
بھرے اسمیں تھے چیدہ چیدہ جواں — شجاع و جری جنگ دیدہ جواں
یہ پہنے ہوئے وردیاں زرد تھے — بہادر دلاور جواں مرد تھے
سجے تھے زرہ خود بکتر سے سب — گرانبار تلوار خنجر سے سب
کمر سے تو تیغ دو پیکر لگی — اور اس دل کی کلغی وہ سر پر لگی
بڑا رعب تھا اسکے افسر پہ بھی — شجاعت تھی ختم اس دلاور پہ بھی
فدا دل سے اپنے سپہدار پر — سوار ایک اسپ وفادار پر
بہت بانکے ترچھے جواں اردگرد — کئے سایہ اس پر نشاں اردگرد
جو تھی فوج پیچھے وہ آفت کی تھی — سواروں کی جرأت قیامت کی تھی
بڑے لمبے چوڑے جواں اسمیں تھے — کئی نامور پہلواں اسمیں تھے
یہ اودی تھے پہنے ہوئے وردیاں — شجاعت میں سب انتخاب جہاں
بڑھاتا تھا دل اسکا سردار فوج — یہ کہتا تھا ان سے وہ جرار فوج
کہ ہاں وقت ہمت ہے شیرو یہی — شجاعت کا دن ہے دلیرو یہی
جو آئے ہیں بچ جانے پائیں نہ ترک — یہاں سے کبھی بچ کے جائیں نہ ترک
انھیں تیغ سے کاٹ کر ڈال دو — تنوں سے جدا کر کے سر ڈال دو
کریں یاد یہ بھی چڑھے تھے کہیں — حماقت سے اپنے بڑھے تھے کہیں
کسی طرح اب دو نہ مہلت انہیں — دکھا دو بس اپنی شجاعت انہیں
کچھ ایسی دلیری سے ان سے لڑو — کہ خیمے میں تم شاہ کے گھس پڑو
ادھر تھا وہ سلطان تیار ہی — جواں مرد تو لے تھے ہتھیار ہی
بجے جنگ کے باجے دونوں طرف — ہوئی واں سے ان واں برطرف
نکل کر جواں پہلی صف سے چلے — جواں مرد دونوں طرف سے چلے

پہنچتے ہی ہتھیار چلنے لگے
بہم وار پر وار چلنے لگے

جھنا جھن کی آواز آنے لگی
اجل ہاتھ اپنا بڑھانے لگی

برسنے لگا خون میدان میں
ہزاروں ہوئے قتل اک آن میں

کوئی ہو کے زخمی گرا تیر سے
تڑپنے لگا کوئی شمشیر سے

کہیں پار دل کے سناں ہو گئی
کہیں کھنچ کے دہری کماں ہو گئی

گئی جس طرف تیغ سن سے نکل
گئی خوف سے جان تن سے نکل

دی سر جو تھا دامنِ خود میں
جو جھپکی پلک تو وہ تھا گود میں

گئی خود ٹکڑے جھلم کے اڑے
پر خچے زرہ کے علم کے اڑے

پڑا تھا سر دی پہ تبجنہ کہیں
پڑا خاک پر پھیلا تھا کہیں

پریشاں پھرے زلف پر خم کی طرح
صفیں ساری الٹی ہوئیں دم کی طرح

نہ لیتے تھے دم بھر بھی دم راجپوت
بڑا کر رہے تھے ستم راجپوت

وہ غصے سے وار ان کا کرنا غضب
زقندان کا رہ رہ کے بھرنا غضب

چمک کر کبھی تیغ سر پر پڑی
کبھی ہو کے ترچھی کمر پر پڑی

کبھی اس کے جوشن پہ آکر گری
کبھی اس کی گردن پہ جا کر گری

کلائی کسی کی کہیں اڑ گئی
وہ ہاتھ اڑ گیا آستیں اڑ گئی

وہ ڈھالیں کٹیں بگڑیاں کٹ گئیں
وہ چلتے کٹے پڈیاں کٹ گئیں

کہیں سر وہی سے کٹ کر گرا!
کہیں تن سناں سے الٹ کر گرا

مسلمان بھی تھے بڑے جوش میں
یہ غصہ تھا ان کو نہ تھے ہوش میں

گئے جب عدو کی وہ صف کی طرف
پھٹی ڈر سے کائی کی صورت وہ صف

لہو میں اسے جا کے نہلا دیا
عدم کی اسے راہ بتلا گیا

ٹپکتا تھا سر سے جبیں سے لہو
گریبان سے آستیں سے لہو

اسی طرح پہروں لڑائی رہی
بہم خوب تیغ آزمائی رہی

برابر رہے ہر طرف کے جواں
رہے لڑتے ہر ایک صف کے جواں

پر آخر میں گھبرا گئے راجپوت
ہزیمت ذرا کھا گئے راجپوت

جو تھا راجپوتوں کا افسر بڑا
جو مشہور تھا واں دلاور بڑا

تہہ تیغ میدان میں آ گیا !
بہادر قریب اجل کھا گیا

ہوئے خوش مسلمان دل بڑھ گئے
وہ صف باندھ کر اور بھی چڑھ گئے

قدم راجپوتوں کے پیچھے ہٹے
وہ لڑتے ہوئے کچھ وہاں سے ہٹے

جو وہ بد دلی سے پریشاں ہوئے
تو شیر اور بھی سب مسلماں ہوئے

ہوئے حملہ آور سب اکبارگی
پڑے ٹوٹ ان پر سب اکبارگی

چلے اس جگہ سے سرک راجپوت
ہٹ آئے در قلعہ تک راجپوت

مدد کو یہاں فوج طیار تھی
مسلح کھڑی بہر پیکار تھی

مگر اب لب بام تھا آفتاب
کسی کو نہ باقی تھی لڑنے کی تاب

لڑائی دم صبح پر اٹھ رہی
سویرے پہ تیغ دوسر اٹھ رہی

جری لڑ کے میداں سے جا رہے ہے
تھکے ماندے خیموں میں آتے گئے

ادھر دل میں شہ کے بشاشت بہت
جوانوں کو حاصل مسرت بہت

کہ کل فتح یہ قلعہ ہو جائے گا
مقابل میں کوئی نہ اب آئے گا

ادھر یہ رتن سین کا بندوبست
سر شام سے جا بجا بندوبست

کہ اب ایسی تدبیر جنگ ہو
کہ سلطان کا قافیہ تنگ ہو

رتن سین کا دھوکے سے قید ہونا

یہ کیوں ساقیا تو پلاتا نہیں
یہ کیوں منہ سے بوتل لگاتا نہیں

اٹھا جلد بوتل خدا کے لیئے
مدد کر مدد کبریا کے لیئے

لڑائی حریفوں سے درپیش ہے
جو میخوار ہے وہ بد اندیش ہے

فلک رنگ دیکھیں بدلتا ہے کیا
اب اس وقت یہ چال چلتا ہے کیا

بجو وہ رات رخصت جہاں سے ہوئی
سیاہی وہ دور آسماں سے ہوئی

تو فوجیں لگیں ہونے طیار پھر
بہادر لگے سجنے ہتھیار پھر

یہ دھڑکا مگر سب جوانوں کو ہے
تمرّد یہ سب پہلوانوں کو ہے

کہ ہوتا ہے دیکھیں دم جنگ کیا
بدلتا ہے اب آسماں رنگ کیا

اٹھے تو وہ ہیں منہ اندھیرے ہی سب
کمر کس رہے ہیں سویرے ہی سب

تردد سے پر کوئی خالی نہیں
وہ چہروں پہ ان کے بحالی نہیں

ہوئی آخر اس روز جنگ اسطرح
رتن سین کا قصد تھا جس طرح

سر قلعہ آکر اڑے راجپوت
وہیں سے سنبھل کر لڑے راجپوت

وہیں سے وہ تیر ان پہ برسا چلے
سر خاک ترکوں کو تڑپا چلے

جوانوں کے سینے جگر چھد گئے
ادھر چھد گئے تیر ادھر چھد گئے

بدن ہر اک کا نشانہ ہوا
کہ ہر سینہ زنبور خانہ ہوا

اگرچہ ادھر سے بھی سستی نہ تھی
کم ان کی وہ پھرتی وہ چستی نہ تھی

ادھر سے بھی بوچھار تیروں کی تھی
ہر اک سمت سے مار تیروں کی تھی

مگر کیا کریں سخت مجبور تھے
جگہ ان کی نیچی تھی معذور تھے

نہ جاتا تھا اپنے ٹھکانے پہ تیر
نہ پڑتا تھا اپنے نشانے پہ تیر

اور ان کا موقف تھا اچھا بہت
نہایت ہی محفوظ اونچا بہت

خطا کوئی تیر ان کا کرتا نہ تھا
کوئی تیر بے جا اترتا نہ تھا

غرض یوں ہی جنگ آزمائی رہی
مہینوں یہ باہم لڑائی رہی

لیا شہ نے آخر یہ حکمت سے کام
دیا صلح کا اس نے اسکو پیام

کہ اب عزم پیکار تم سے نہیں
کوئی رنج زنہار تم سے نہیں

ہوئے دفع دل سے خیالات وہ
مرے دل میں باقی نہیں بات وہ

قیام اب یہ نہ ہوگا زیادہ مرا
کہ ہے واپسی کا ارادہ مرا

جو ممکن ہو تو آکے مل جاؤ تم
نہ وسواس دل میں کوئی لاؤ تم

اگر تم کو کچھ عذر آنے میں ہو
کوئی وہم میرے بلانے میں ہے

تو کچھ اس میں اصرار مجھ کو نہیں
میں خود تم سے ملتا ہوں آکر وہیں

یہ کہہ کر ادھر ہی وہ اٹھ کر چلا
لئے ساتھ کچھ اپنے افسر چلا

جو راجہ نے پیغام شہ کا سنا
اور آنے کا بھی اس کے مژدہ سنا

تو وہ بڑھ کے ہمراہ لایا اُسے
سر تخت لاکر بٹھایا اُسے

خزانہ نثار اپنا اس پر کیا
زر و لعل و گوہر نچھاور کیا

سب آآ کے نذر اس کو دینے لگے
قدم اسکے جھک جھک کے لینے لگے

اطاعت سے خوش اسکی سلطاں ہوا
نفاست پہ ہر شے کی حیراں ہوا

وہ پھر قلعہ کی سیر کرنے لگا
دم اس کی وہ صنعت کا بھرنے لگا

بہت قلعہ کا صحن بھایا اُسے
وہ موقع بہت ہی خوش آیا اسے

جما دیر تک دل لگا کر وہیں
گیا بیٹھ کرسی منگا کر وہیں

ہوا راجہ بھی جلوہ فرما وہیں
گئے جم سب اعلیٰ و ادنیٰ وہیں

اک آئینہ سلطاں کے خدام نے
وہیں رکھدیا بادشاہ کے سامنے

یہ تعلیم راجہ کے دشمن کی تھی
یہ تدبیر اگھور برہمن کی تھی

کہا تھا کہ جب آپ واں جائیں گے
قیام اس جگہ کچھ جو فرمائیں گے

تو وہ گل سنے گی یہ اندر ضرور
وہ جھانکے گی کوٹھے پہ چڑھ کر ضرور

رہے گا جو یہ آئینہ سامنے
تو عکس اس کا آجائے گا سامنے

ہوا واقعہ درحقیقت وہی
شہنشہ کو پیش آئی صورت وہی

پس پشت سلطاں کے تھا در کوئی
اسی سمت واقع تھا منظر کوئی

اٹھا کے وہ چلمن سے جھانکنے لگی
ادھر جھانکنے وہ گل تر لگی

چھپا حسن اس کا نہ چلمن سے وہ
پڑا اس کے آئینے پر چھن کے وہ

پڑا عکس کیا شہ پہ بجلی گری
الٹ کر سر خاک کرسی گری

یہ سمجھا کوئی کیوں یہ گھائل ہوا
یہ کیوں بے چھری تیغ بسمل ہوا

تردد سے سب لوگ گھبرا گئے | کلیجے جگر منھ کو آ آ گئے
اٹھا کر وہ منھ اس کا تکنے لگے | گلاب اس کے منھ پر چھڑکنے لگے
رتن سین گھبرا گیا اور بھی | وہ بدنامیوں سے ڈرا اور بھی
مگر آ گیا ہوش اُسے جلد ہی | یہ راجہ سے بات اب بنا کر کہی
کہ میں تھوڑے عرصہ سے بیمار ہوں | اِسی عارضے میں گرفتار ہوں
یہ دورہ کسی طرح جاتا نہیں | دوا اس کی کوئی بتاتا نہیں
یہ کہہ کر وہ خیمے کو اپنے چلا | رتن سین بھی ساتھ اسکے چلا
وہ خیمہ تلک ساتھ آیا چلا | ملائے ہوئے ہاتھ آیا چلا
وہ آیا تو پھر گھر نہ جانا ہوا | وہ خیمہ اُسے قید خانہ ہوا
اسی دم گرفتار وہ ہو گیا | سزا کا سزاوار وہ ہو گیا
چھٹا تخت وہ حکمرانی چھٹی | وہ ہر دم کی غمخوار رانی چھٹی
وہاں پھر تو سلطاں نہ دم بھر رکا | نہ وہ خود رکا اور نہ لشکر رکا
دیا کوچ کا حکم اس نے وہیں | اکھاڑے گئے سب کے خیمے وہیں
رتن سین کو ساتھ لیکر چلا | دغا راجپوتوں کو دے کر چلا
یہ سوچا کہ رانی کہاں جائے گی | وہ راجہ کی خاطر وہیں آئے گی

نظر بند پہنچا کے اس کو کیا
کیا رنج و غم میں اُسے مبتلا

پدماوت اور ناگمت کا رتن سین کی مفارقت میں تڑپنا

یہ میخانے آج ماتم ہے کیوں! | یہ چھایا ہوا ساقیا غم ہے کیوں
یہ کیوں ہر طرف ہے خرابی پڑی | سر خاک ہے کیوں گلابی پڑی
یہ مے ہو گئی ہے لہو کس لئے | پڑے ہیں یہ اوندھے سبو کس لئے
خرابات میں کیوں یہ کہرام ہے | بھرے اشک آنکھوں میں کیوں جام ہے

رتن سین جو شہ کا قیدی ہوا　　اسیر غم نا امیدی ہوا
تو کہرام ہر ہر جگہ مچ گیا　　بڑا قلعہ میں تہلکہ مچ گیا
بڑے رنج و ماتم کا ساماں ہوا　　بڑے دکھ بڑے غم کا ساماں ہوا
پریشاں اراکین دولت ہوئے　　گرفتار رنج و مصیبت ہوئے
کچھ اس طرح گھبرا گئے راجپوت　　کہ جینے سے تنگ آ گئے راجپوت
کوئی فکر دکوشش بن آئی نہ تھی　　کوئی گفتگو پیش جاتی نہ تھی
وہ اس وجہ سے شہ سے لڑتے نہ تھے　　وہ اس خوف سے کچھ بگڑتے نہ تھے
کہ پہونچے نہ نقصاں رتن سین کو　　ستائے نہ سلطاں رتن سین کو
قیامت کا کہرام تھا شہر میں　　بپا ماتم عام تھا قصر میں
بہت رانیوں کا برا حال تھا　　جگر کثرت غم سے پامال تھا
سٹرن سی وہ بیچاریاں ہو گئیں　　غم و رنج سے نیم جاں ہو گئیں
بہت انکو سمجھاتے تھے آ کے سب　　یہ کہتے تھے قسمیں وہ کھا کھا کے سب
کہ ہم اپنی تدبیر دکھلائینگے　　بہت جلد اس کو چھڑا لائیں گے

مگر ان کی حالت بدلتی نہ تھی
ذرا بھی طبیعت سنبھلتی نہ تھی

سلطان علاؤالدین کا پدماوت کے پاس کٹنی کا بھیجنا

پلا دختر رز سے ساقی مجھے　　نہیں ہجر کی تاب باقی مجھے
مرے ہاتھ وہ شوخ آتی نہیں　　مجھے شکل اپنی دکھاتی نہیں
مجھے تو کوئی اپنی فطرت دکھا　　مجھے چاند سی اس کی صورت دکھا
عنایت نہ ہوگی تری جب تلک　　نہ ہاتھ آئے گی وہ حسیں تب تلک
وہ شہ دل کو کچھ دن سنبھالے رہا　　محبت کو اس بت کی ٹالے رہا
مگر ضبط اس سے نہ کچھ ہو سکا　　نہ گھل مل کے وہ اپنا جی کھو سکا

وہ آتش دبی شعلہ ور ہو چلی ترقی دردِ جگر ہو چلی
وہی جھانکنے والی پیشِ نظر وہی آئینے والی پیشِ نظر
کہا ایک کٹنی سے آخر یہ حال بتایا غمِ ہجر کا وہ ملال
کہا گر کسی فکر و تدبیر سے کسی حسنِ فطرت سے تزویر سے
اُسے تو اڑا لائے دہلی تلک وہ گلپوش آجائے دہلی تلک
تو ہو جاؤں میں دل سے ممنون ترا مرا کاں لعل و گوہر سے بھر دوں ترا
کہا اس نے یہ کون سا کام ہے یہاں اس کو لانا مرا کام ہے
یہ کہہ کر وہ سلطاں سے رخصت ہوئی روانہ بصد فکر و حکمت ہوئی
چلی بن کے جوگن وہ ایسی حسیں کہ توقیر اسکی ہوئی ہر کہیں
اسی طرح فطرت دکھاتی ہوئی دلوں کو لبھاتی رجھاتی ہوئی
وہ اک دن وہاں آکے داخل ہوئی وہ ہر روز کی ختم منزل ہوئی
بہت ہی وہاں اس کا شہرہ ہوا بڑا جوگ کا اس کے چرچا ہوا
یہاں تک وہ پہونچی حویلی میں بھی یہ بات اس نے واں پدمنی سے کہی
کہ دہلی سے میں آرہی ہوں ادھر ہوا واں جو زنداں میں اکدن گزر
جواں اک گرفتار آیا نظر بہت لاغر و زار آیا نظر
کہا مجھ سے لوگوں نے راجا ہے یہ سپہدار چتوڑ گڑھ کا ہے یہ
مجھے دیکھ کر اس جواں نے کہا یہ پیغام اس نیم جاں نے کہا
کہ جانا جو چتوڑ گڑھ ہو ترا گزر ہو محل کی طرف جو ترا
تو کہنا یہ پدماوتی سے پیام کہ ہے زندگی بے تمہارے حرام
تمہیں مرتے مرتے اگر دیکھ لوں کسی طرح پھر اک نظر دیکھ لوں
تو ہو جائے آساں مصیبت مری نکل جائے دل سے یہ حسرت مری
میں رونے لگی سنکے پیغام یہ کہا اس سے کر دوں گی میں کام یہ
وہ پیغام بارے ادا ہو گیا جو وعدہ کیا تھا وفا ہو گیا

بڑا حال اس کا یہ سنکر ہوا — غضب کا اثر اسکے دل پر ہوا
کہا رو کے جوگن سے لیچل مجھے — بغیر اس کے دیکھے نہیں کل مجھے
خدا کے لئے تو ملا دے مجھے — پہونچنے کی حکمت بتا دے مجھے
بتا کس طرح میں بروگن چلوں — چلوں یوں ہی یا بن کے جوگن چلوں
یہ کہنے کو تو اس نے اس سے کہا — مگر اپنے دل میں یہ پھر اس نے کہا
کہیں مجھ سے یہ چھل کرتی نہ ہو — کہیں مجھ سے یہ کل کرتی نہ ہو
یہ بھیجی ہوئی شہ کی آئی نہ ہو — یہ جوگن سکھائی پڑھائی نہ ہو
خواصوں نے بھی اس کی سوچا یہی — خیال ان کے دل میں بھی گزرا یہی
لگیں پوچھنے اس سے حال اسطرح — کئے اس سے دو اک سوال اسطرح
کہ وہ دے سکی کچھ نہ اس کا جواب — ہر اک بات میں وہ ہوئی لاجواب
فریب اس کا سب دلنشیں ہوگیا — یہ کٹنی ہے سب کو یقیں ہوگیا
اسی دم وہاں سے وہ ٹالی گئی! — بڑی ذلتوں سے نکالی گئی
مگر پدمنی کی یہ حالت ہوئی — کہ ہر عضو سے سلب طاقت ہوئی

تپ غم رگوں میں اثر کر گئی
لہو کثرت غم جگر کر گئی

پدماوت کا گورا اور بادل سے شکایت کرنا اور رتن سین کو قید سے چھڑا لانا!

دیا ساقی کیا تو نے دھوکا مجھے — سمجھا نہ تھا میں تو ایسا تجھے
جدا دخت رز مجھ سے کیا ہو گئی — تری وہ عنایت ہوا ہو گئی
نہ گویا تھی کچھ جان پہچان ہی — جو رسمیں تھیں ان میں نہ تھی جان ہی
رہی پدمنی کی جو حالت ہوئی — جو قوت سب اعضا سے رخصت ہوئی

تو گورا و بادل سے رو کر کہا
اداس ان سے کچھ بلکہ ہو کر کہا

کہ ظاہر ہوا تم میں جرأت نہیں
بہت دل کے کچے ہو ہمت نہیں

نہ میرا تعلق ہے نہ راجا کا ہے
عجب حال افسوس دنیا کا ہے

اگر یوں ہی شہ کا خطرہ ہے تمہیں
اگر اپنے چچا جالوں کا ڈر ہے تمہیں

تو تم اس قدر غم گساری کرو
حوالے مرے فوج ساری کرو

لڑوں گی میں خود جا کے سلطان سے
عوض لوں گی ہر اک مسلمان سے

خدا چاہے گا تو چھڑا لاؤں گی
فدا ورنہ راجا پہ ہو جاؤں گی

یہ دونوں تھے غم خوار اسکے بڑے
رتن سین کے دونوں تھے بھانجے

وہاں فرد جرأت میں ہمت میں تھے
بڑے نامور زور و طاقت میں تھے

وہ شرمندہ یہ بات سنکر ہوئے
بہت صدمے انکے دلوں پر ہوئے

کیا عرض وقفہ ہوا اس لئے لئے
لڑائی میں عرصا ہوا اس سے لئے

کہ راجہ کے حق میں مضرت نہ ہو
کہیں اور شہ کو عداوت نہ ہو

سر اب جو ملی ہے اجازت ہمیں
جو لڑنے کی ہے اب ہدایت ہمیں

تو سن لیں گی لڑنا ہمارا ابھی آپ
سر جنگ اڑنا ہمارا ابھی آپ

وہاں سے وہ رخصت یہ کہکر ہوئے
مسلح وہ دونوں دلاور ہوئے

روانہ ہوئے دونوں حکمت کیساتھ
چلے واں سے اس حسن فطرت کیساتھ

کہ فنیں بہت ساتھ لیکر چلے
جواں چھپ کے ہر اک کے اندر چلے

اور اک خاص سکھیاں بھی ساتھ لی
یہ اک ایک سے بات مشہور کی

کہ پدماوتی سوئے دہلی چلی
چھڑانے کو راجہ کے خود ہی چلی

خواصوں کے ہمراہ ہے جا رہی
جدائی بہت اب ہے تڑپا رہی

پہونچکر وہ دہلی ٹھہرتے گئے
الگ شہر سے سب اترتے گئے

وہ فنیں جوانوں کی دھر دی گئیں
ملا کر برابر وہ کر دی گئیں

اترتے ہی پہلے کیا اب یہ کام
دیا شہ کو یہ پدمنی کا پیام

کہ گھر بار اپنا ہیں سب چھوڑ کر　　یہاں آ گئی ہوں میں کر کے سفر
مجھے شاہ کے حکم میں عذر نہ کیا　　مگر سب سے پہلے یہ ہے التجا
کہ دو بات کر لوں میں راجا سے بھی　　نہ باقی رہے جس میں جھگڑا کوئی
اُسے دو گھڑی کی اجازت ملے　　مرے پاس آنے کی مہلت ملے
شہنشہ نے جو نام اس کا سُنا　　اور اس پر وہ پیغام اس کا سُنا
تو مارے خوشی کے وہ گھبرا گیا　　کہا لو مراد اپنی میں پا گیا!!
کہا یہ اثر میری اُلفت کا ہے　　یہ سب جذب میری محبت کا ہے
اسی وقت راجہ کو بھجوا دیا!　　مگر یہ بھی ارشاد فرما دیا!؟
کہ جا کر نہ ٹھہرے وہاں دیر تک　　نہ صحبت رہے درمیاں دیر تک
پہونچتے ہی پھر واں نہ عرصہ کیا　　قفس میں اسے جلد بیٹھا لیا
کہا اب توقف نہ فرمایئے　　قفس ہی قفس اب چلے جایئے
قفس کا جہاں سلسلہ ہو گا ختم　　جہاں جا کے یہ راستہ ہو گا ختم
سواری ملیگی وہاں آپ کو　　مدد دیں گے فوجی جواں آپ کو
اسی راہ سے وہ یہ سُنکر چلا　　قفس کے وہ اندر ہی اندر چلا
وہاں جا کے حاضر سواری ملی　　مدد کے لئے فوج ساری ملی
جواں کچھ اسے لیکے چلتے ہوئے　　چلے پیترے وہ بدلتے ہوئے
نگہبان مجبور ہی رہ گئے　　گھوڑے دور کے دور ہی رہ گئے
اس اثنا میں قفسوں میں سنبھلے جواں　　لئے تیغ ہاتھوں میں نکلے جواں
پکارا کہ اے بدگہر بادشاہ　　جفا آشنا حیلہ گر بادشاہ
دغا سے مقید کیا تھا جسے　　بڑا تو نے دھوکا دیا تھا جسے
چھڑا ہی لیا جلد آ کر اسے　　لئے جاتے ہیں دیکھ لے گھر اُسے
اگر کچھ ہے جرأت تو آ سامنے　　جوانوں کو میداں میں لا سامنے
یہ کہہ کر بڑھے واں سے راجا کی سمت　　چلے اپنے اس حکم فرما کی سمت

کہ پہونچے نہ اسکو مضرت کہیں — کوئی پھر نہ برپا ہو آفت کوئی
ہوئی شہ کو اس کی خبر جس گھڑی — مفصل یہ پہونچی خبر جس گھڑی
تو وہ انتہا کو پریشاں ہوا — حماقت پہ اپنی پشیماں ہوا!
کہا کر گئے یہ تو جرأت بڑی — ہوئی یہ تو مجھ سے حماقت بڑی
اسی وقت وہ فوج لیکر چلا — بہت ہی بڑا لیکے لشکر چلا
کیا ان پہ دھاوا لبا راہ میں — ہوا جا کے پھر معرکا راہ میں
پریشاں بہت دل میں گورا ہوا — اُسے سخت وسواس اس کا ہوا
کہ راجا کو پہونچے نہ صدما کوئی — نہ لاحق ہو پھر رنج و ایذا کوئی
خدا جانے کیا پیش آئے یہاں — مقدر مجھے کیا دکھائے یہاں
یہ بادل کو اس نے بلا کر کہا — شہنشہ کی فوجیں دکھا کر کہا
کہ ہٹ جاؤ یاں سے طرح دیکے تم — چلے جاؤ راجہ کو گھر لیکے تم
چلا آؤں گا میں بھی لڑتا ہوا — سرکتا ہوا اور اڑتا ہوا
نہ راجہ کو یہ گرچہ منظور تھا — مگر مصلحت سے وہ مجبور تھا

ہوا لیکے بادل روانہ اُسے
چلا لیکے وہ سوئے خانہ اُسے

رتن سین اور دیوپال کی لڑائی۔ بعد فتح رتن سین کا رحلت کرنا۔ ناگمت اور پدماوتی کا ستی ہو جانا

ہوس آج دل میں نہ ساقی رہے — نہ تلچھٹ تلک مے کی باقی رہے
یہ ہے صحبت آخر اے مہرباں — کہاں یہ مزے سب پھر اے مہرباں
گھڑوں میں ہو جتنی پلادے مجھے — سیہ مست کر دے تھکادے مجھے
رتن سین داخل جو گھر میں ہوا — خوشی کا اثر راج بھر میں ہوا

خوشی سے نہ پھولے سماتے تھے لوگ زر و سیم ہر سو لٹاتے تھے لوگ

نہ حد رانیوں کی مسرت کی تھی خوشی ان کو حاصل قیامت کی تھی

خصوصاً وہ غنچہ دہن پدمنی گل اندام گل پیرہن پدمنی

بہت ہی مسرت سے تھی جوش میں وہ خوش اس قدر تھی نہ تھی ہوش میں

قدم جھک کے بادل کے لیتی تھی وہ دعا دل سے گورا کو دیتی تھی وہ

ملے شب کو تو قصہ غم چھڑے فسانے جدائی کے باہم چھڑے

رتن سین نے سب مصیبت کہی وہ زنداں کی ساری حقیقت کہی

کہ اس اس طرح مجھ پہ سختی رہی ترقی پہ یوں تیرہ بختی رہی

اور اس پر جدائی تمہاری ستم وہ ہر وقت کی بیقراری ستم

تمہاری ہی فرقت کا غم رات دن یہی مجھ کو گھیرے الم رات دن

خدا نے دوبارہ جلایا مجھے کہ پھر لا کے تم سے ملایا مجھے

وہ گلپوش سن سن کے روتی رہی منہ اشکوں سے وہ اپنا دھوتی رہی

کہا پھر ہوئی جو مصیبت مجھے جدائی نے دی جو اذیت مجھے

اسے کسطرح تم پہ ظاہر کروں تمہیں کسطرح اس سے ماہر کروں

چھٹے مجھ سے تم کیا کہ میں لٹ گئی مری جان تن سے مرے چھٹ گئی

نہ تھا بے تمہارے ٹھکانا مرا عدو ہو گیا تھا زمانہ مرا

جو سلطاں کی کشتی سے عزت بچی فریبوں سے اس کے جو حرمت بچی

تو پھر دشمن جاں ہوا دیو پال! مرے جی کا خواہاں ہوا دیو پال

یہ اک شوخ عورت سے بھیجا پیام کہا اس نے آ کر یہ اس کا پیام

کہ چھٹنا ہے راجہ کا دشوار اب رہائی کی کوشش ہے بیکار اب

نہ چھوڑے گا زنہار سلطاں اسے ملا زندگی بھر کو زنداں اسے

عبث زندگی تلخ کرتی ہے تو عبث غم میں راجہ کے مرتی ہے تو

بس اب بیٹھ بے فکر گھر میں مرے ٹھہر آ کے دل میں جگر میں مرے

کروں گا میں راجہ سے عزت سوا
مجھے تجھ سے اس سے ہے الفت سوا

یہ سن کر کلیجا مرا پھٹ گیا!
بدن کا لہو اور بھی گھٹ گیا!

نکالی گئی وہ تو ذلت کے ساتھ
بڑی سختیوں اور صعوبت کے ساتھ

مگر روئی میں بیکسی پر بہت
کڑھی اپنی اس بے بسی پر بہت

کہ اب ایسی عزت مری ہو گئی
اب اس طرح حرمت مری ہو گئی

کہ جو جس کے دل نے سمجھا یا کہا
جو کچھ جس گھڑی منہ میں آیا کہا

وہ بے چین یہ بات سنکر ہوا
بڑا غم بڑا رنج دل پر ہوا

کہا اس نے یہ تو قیامت ہوئی
اب اس کی بھی اس طرح جرأت ہوئی

سحر ہوتے ہی اس طرف وہ بڑھا
جو کچھ فوج تھی اس پہ لیکر چڑھا

وہ مانع ہوئی گرچہ حد سے سوا
بہت منع لڑنے سے اسکو کیا

مگر کم نہ وہ اس کا غصا ہوا
سوا بلکہ وہ جوش اس کا ہوا

وہ ظالم بھی کہمل کا سردار تھا
قوی تھا دلاور تھا جرار تھا

وہ سنتے ہی آکر مقابل ہوا
مع فوج و لشکر مقابل ہوا

مگر رائے اب طے یہ پائی بہم
کہ خلق خدا پر ہو کیوں کچھ ستم

سمجھ لیں بہم چل کے میدان میں
جو ہوتا ہو ہو جائے اک آن میں

اسی طرح آخر وہ دونوں لڑے
بہت دیر تک معرکہ میں اڑے

فن جنگ میں دونوں ہشیار تھے
ہر اک فن سے دونوں خبردار تھے

چلے وار پر وار شمشیر کے
بہت ہاتھ کاٹے گئے تیر کے

لگاتار نیزے بھی آتے گئے
شجاعت کے جوہر دکھاتے گئے

کوئی ان میں پر غالب آتا نہ تھا
کسی کو کوئی بس میں پاتا نہ تھا

پر آخر میں باہم جو نیزے چلے
برابر ادھر سے اُدھر سے چلے

تو راجہ پہ قابو وہ کچھ پا گیا
سناں ایک پہلو میں وہ کھا گیا

مگر رنگ بدلا نہ جرار کا
کیا وار اس نے بھی تلوار کا

وہ غصے کا ہاتھ اس پہ ایسا پڑا ۔۔۔ کہ سر تن سے کٹ کر الگ جا پڑا
کہا بڑھ کے مارا وہ سرکار کو ۔۔۔ وہ بھیجا جہنم میں عیار کو
یہ دیکھا تو فوج اسکی شاداں ہوئی ۔۔۔ شجاعت کی اسکی ثنا خواں ہوئی
پر اس کا بھی تھا زخم کاری بہت ۔۔۔ لہو اس جگہ سے تھا جاری بہت
وہ اس درد سے سخت گھبرا گیا ۔۔۔ پہونچتے ہی خیمے میں غش آ گیا
پریشاں ہوئے اہل لشکر بہت ۔۔۔ ہراساں ہوئے سارے افسر بہت
چلے واں سے لیکر وہ سب گھر اسے ۔۔۔ اتارا محل میں پہونچکر اُسے
اسے پدمنی اک نظر دیکھ کر ۔۔۔ لہو میں بدن اس کا تر دیکھ کر
سڑن ہو گئی چیخ کر گر پڑی ۔۔۔ زمیں پر وہ رشک قمر گر پڑی
ہوا سب پہ ثابت یہ مر گئی ۔۔۔ یہ راجہ سے پہلے سفر کر گئی
حویلی میں حشر اک بپا ہو گیا ۔۔۔ یہی شور تھا ہائے کیا ہو گیا
لگی پیٹنے اپنا سر ناگمت ۔۔۔ لگی رونے دل تھام کر ناگمت
کچھ اتنے میں راجہ کو راحت ملی ۔۔۔ ذرا اسکو اس غش سے فرصت ملی
کہا ناگمت پدمنی ہیں کہاں ۔۔۔ وہ غمخوار عاشق مری ہیں کہاں
کہاں ہیں بلاؤ مرے سامنے ۔۔۔ انھیں جلد لاؤ مرے سامنے
وہ گو ہوش میں فرط غم سے نہ تھیں ۔۔۔ وہ قابو میں فرط الم سے نہ تھیں
خواصوں نے لیکن اٹھایا انہیں ۔۔۔ سرھانے بمشکل بٹھایا انھیں
وہ مجروح رویا انھیں دیکھکر ۔۔۔ منھ اشکوں سے دھویا انھیں دیکھکر
کہا اب تو دُنیا سے جاتے ہیں ہم ۔۔۔ ہمیشہ کو اب منھ چھُپاتے ہیں ہم
تمہیں داغ فرقت کا دیکر چلے ۔۔۔ اور اپنے جگر پر بھی لے کر چلے
کچھ اس طرح ہم سے جُدائی ہوئی ۔۔۔ کہ یوں جلد تم سے جُدائی ہوئی
نہ سمجھے تھے یوں جلد مر جائینگے ۔۔۔ سفر جلد دنیا سے کر جائینگے
تڑپ کر مرے غم میں رونا نہ تم ۔۔۔ خدا کے لئے جان کھونا نہ تم

کوئی رنج اس طرح سہتا نہیں — سدا کوئی دنیا میں رہتا نہیں

یہ کہہ کر وہ رخصت بالآخر ہوا — دیار عدم کا مسافر ہوا

صراحی سے ساغر جدا ہوگیا — چمن سے گل تر جدا ہوگیا

وہ اس حسن سے رانیاں چھٹ گئیں — وہ گلفام گل پیرہن لٹ گئیں

وہ جینا نہ آخر خوش آیا انھیں — وہ گھل گھل کے مرنا نہ بھایا انھیں

وہ جی کھونے کو مستعد ہوگئیں — ستی ہونے کو مستعد ہوگئیں

عزیزوں نے ہر چند روکا انھیں — دیا لاکھ سب نے دلاسا انھیں

مگر باز آئیں نہ زنہار وہ — ہوئیں حسب دستور طیار وہ

اسے لیکے دولوں ستی ہوگئیں — وہ پیاری حسیں حوریں کھو گئیں

دم میں ہوگئیں راکھ کی ڈھیر ہائے — ہوا ایک گھڑی بھر میں اندھیر ہائے

نہ راجہ رہا اور نہ رانی رہی — فقط ایک ان کی کہانی رہی

نہ ساقی نہ میخانہ باقی رہا — نہ وہ دور پیمانہ باقی رہا

گرے اشک ڈھل کر نگاہوں کے ساتھ — کلیجے نکل آئے آہوں کے ساتھ

جسے دیکھئے غم سے ناشاد تھا — نہ تھا شہر وہ محشر آباد تھا

ادھر تنگ سلطاں سے گورا بھی تھا — برا حال میداں میں اس کا بھی تھا

کئی دن برابر لڑائی رہی ! — بہم خوب تیغ آزمائی رہی

مگر پھر وہیں وہ بھی کام آگیا — اجل کا اسے بھی پیام آگیا

شہنشاہ کو فتح حاصل ہوئی — جو واقع تھی آساں وہ مشکل ہوئی

وہ چتوڑ گڑھ پھر وہاں سے چلا — تمنا میں پدماوتی کی چلا

وہاں آکے راجا کا مرنا سنا — وہ ان رانیوں کا گزرنا سنا

بڑا اس کو صدمہ یہ سنکر ہوا — بڑا رنج و غم اسکے دل پر ہوا

کہا اپنے دل میں کہ یہ کیا کیا — بہت میں نے یہ کام بے جا کیا

ہوا قہر میرے خیالات سے — گئیں ان کی جانیں مری ذات سے

کوئی ظلم کرتا نہیں اس طرح
خدا کو دکھاؤں گا منھ کس طرح

یہ کہہ کر وہ روتا گیا اس جگہ
سنے اشکوں سے ہو گیا اس جگہ

وہ دونوں ستی ہو گئی تھیں جہاں
وہ رشک قمر کھو گئی تھیں جہاں

کچھ ان کی پریشاں اٹھالی وہ خاک
بھری آہ اور سر پہ ڈالی وہ خاک

کہا اس مری زندگانی پہ خاک
مری شوکت خسروانی پہ خاک

ہوا زندگی بھر کو ناشاد میں
ہوا دل کے ہاتھوں سے برباد میں

گیا بیٹھ پھر آ کے وہ قلعہ میں
لگا رونے پچھتا کے وہ قلعہ میں

بلایا وہ ان دونوں دلبند کو
رتن سین کے دونوں فرزند کو

انھیں بندۂ لطف و شفقت کیا
ملا سرفرازی کا خلعت کیا

کنول سین کو واں کا راجا کیا
بہت ہی بلند اس کا رتبا کیا

کیا پھر وزیر اس کا نگسین کو
بنایا امیر اس کا نگسین کو

رکا پھر نہ دہلی وہ چلتا ہوا
انھیں کھو کے ہاتھ اپنا ملتا ہوا

خاتمہ

یہ اردو کی ساری مری مثنوی
یہ پر دردہ حسرت بھری مثنوی

نتیجہ مری پہلی حالت کا ہے
یہ جوش ابتدائی طبیعت کا ہے

مجھے ناز و فخر اس پہ کوئی نہیں
مجھے دعوۂ شعر گوئی نہیں

غرض نام سے ہے نہ شہرت سے ہے
نہ بحث اس میں اپنی لیاقت سے ہے

خوشی دل کی تھی دل کو بہلا دیا
اسی طرح دل اپنا سمجھا لیا

یہ امید اب ذی کمالوں سے ہے
گزارش یہ نازک خیالوں سے ہے

کہ میری خطا دیکھیں بھالیں نہ کچھ
نظر اس کے عیبوں پہ ڈالیں نہ کچھ

مروت سے اخلاق سے کام لیں
جہاں پائیں لغزش مجھے تھام لیں